عصمتِ انبیاءؑ

اور

مولانا مودودی

حضرت مولانا سید طاہر حسین گیاوی مدظلہ

کتب خانہ نعیمیہ دیوبند (یو۔پی)

عصمتِ انبیاء اور مولانا مودودی

عقل و نقل کے آئینے میں

از

حضرت مولانا سید طاہر حسین صاحب گیاوی مدظلہ

ناشر

کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

تفصیلات

نام کتاب — عصمتِ انبیاء، اور مولانا مودودی عقل و نقل کے آئینے میں۔

مؤلف — مولانا سیّد طاہر حسین صاحب گیاوی مدظلہ،

ناشر — کتبخانہ نعیمیہ دیوبند (یوپی)

بار اشاعت — چوتھا ایڈیشن ۱۴۱۸ھ

ملنے کے پتے

دارالعلوم حسینیہ ڈنڈیلہ کلاں پوسٹ رہلا ضلع پلاموں (بہار)

مکتبہ حلیمی لبوکھر پوسٹ باراہاٹ ضلع بانکا

مولانا محمد زاہد حلیمی قاسمی مقام و پوسٹ سمریا ضلع بھاگل پور

مولوی سیّد عبدالناصر مغیث مقام سرکی چک پوسٹ سندیش ضلع بھوجپور (بہار)

حرفِ آغاز

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم ، اما بعد :-

ہمارا عقیدہ یہ ہیکہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں ، ان سے کوئی گناہ صغیرہ و کبیرہ صادر نہیں ہوا ، نبوت سے قبل بھی عصمت کی دولت سے مالامال رہے ، اور نبوت کے بعد بھی ، تاکہ وہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کیطرف سے امت پر پیش کریں ، امت اس پر پورے یقین کے ساتھ عمل کرے اور وہ کسی شک و شبہ میں مبتلا نہ ہونے پائے ،

لیکن جہاں بہت سے مسائل میں ملحدوں نے شکوک و شبہات پیدا کر کے اپنی عاقبت برباد کی ہے ، اسی طرح عصمتِ انبیاء علیہم السلام کے مسئلہ میں بھی یہ لکھ کر کہ عصمتِ انبیاء کرام کے لئے لازم نہیں ہے ، اپنی عاقبت خراب کی ہے۔

سب سے پہلے احمد امین مصری نے اپنی کتاب ضحی الاسلام میں لکھا کہ یہ مسئلہ علماءِ اہلِ سنت کا ایجاد کردہ ہے پھر دیں سے مولانا ابوالاعلی مودودی بھی متاثر ہوئے اور انہوں نے بھی انبیاء کرام کے معصوم ہونے کا انکار کیا اور اپنی کتابوں میں اس مسئلہ پر قلم فرسائی کی۔

ضرورت تھی کہ اس مسئلہ پر کتاب و سنت کی روشنی میں بتایا جائے کہ

عصمتِ انبیاء کرام کا مسئلہ عہد صحابہ کرام سے آج تک مسلّم چلا آرہا ہے اور اہلِ سنّت والجماعت بھی اس کے منکر نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے سلطان المناظرین حضرت الحاج مولانا سید طاہر حسین صاحب گیاوی مدظلہ العالی بانی و مہتمم دارالعلوم حسینیہ پلاموں کو کہ انہوں نے اس مسئلہ پر کتاب و سنّت کی روشنی میں پوری بحث کر کے ثابت کیا کہ انبیاء کرام معصوم ہیں۔ یہ کتاب آیات قرآنی اور احادیث کے حوالجات سے مزین ہے۔ مولانا موصوف نے کافی محنت کی ہے اس کتاب کے پڑھنے سے اندازہ ہوگا کہ ملحدین نے کہاں کہاں دھوکہ کھایا ہے۔ اور کس کس طرح غلط استدلال کیا ہے۔

مختصر یہ کہ کتاب مسلمانوں کے لئے مفید ہے اور اس کا مطالعہ ضروری ہے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی اصلاح فرمائے جن کیلئے کتاب لکھی گئی ہے۔

محتاج دعاء

محمد زاہد حلیمی قاسمی بھاگل پوری

ارجمادی الاوّل ۱۴۱۸ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وعلیٰ اصحابہ واتباعہ اجمعین ۔

زیر نظر کتاب کی ترتیب سے بہت پہلے سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے متعلق میرے علم میں یہ بات آچکی تھی کہ وہ اپنی آزاد خیالی کی وجہ سے بعض عقائد میں اہلسنت والجماعت کے طریقے سے ہٹ گئے ہیں اور یہ بات بھی سنا کرتا تھا کہ جو لوگ ان کے نظریات سے متفق ہیں خصوصًا جماعتِ اسلامی کے بارے میں بھی یہ بات سننے میں آچکی تھی کہ وہ اپنی تمام تر فکری اور عملی سرگرمیوں میں مودودی صاحب کے افکار و خیالات کی پابند ہے اس لئے یہ جماعت کتاب وسنت کی متوارث شاہراہ سے الگ ہو چکی ہے لیکن ان سب کے باوجود کوئی ایسا بنیادی اختلاف جو کتاب وسنت کی روشنی میں کھلی گمراہی اور زیغ وضلال سے تعبیر کیا جا سکے میں اپنے طور پر محسوس نہیں کر پاتا تھا جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مودودی صاحب اور ان کی جماعت کے متعلق اپنا ذاتی مطالعہ کوئی خاص نہ تھا لیکن بعض رسائل اور مضامین کے ذریعے یہ خیال پیدا ہو چکا تھا کہ مودودی صاحب کے افکار وخیالات اچھے نہیں ہیں تاہم بدگمانی اس درجے کی نہ تھی کہ جسے ان کے مخالفین کی تائید کہا جا سکے مگر خدا بھلا کرے مجلس دعوۃ وتحقیق سر امیر

ضلع اعظم گڈھ کا جس نے دینی عقائد کے ایک اہم مسئلے پر ایک کتابچہ شائع کیا۔ اتفاق سے وہ کتابچہ میری نگاہ سے بھی گذرا اس کے اندر عصمتِ انبیاء کے متعلق دو متقابل تحریروں کا جائزہ لیکر صحیح رائے کی نشاندہی کی گئی تھی پھر اس رسالے کے جواب میں کچھ کتابچے بھی شائع ہوئے اس طرح کتابی سوال و جواب کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا جس کی وجہ سے مجھے بھی یہ خواہش ہوئی کہ مسئلے کی اصل حقیقت معلوم کرنی چاہیئے چنانچہ میں بھی اس کی تحقیق میں لگ گیا۔ کافی محنت اور تحقیق و جستجو کے بعد میں جس نتیجہ پر پہونچا ہوں اس کو تفصیل کے ساتھ زیرِ نظر کتاب کے ذریعہ ناظرین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں تاکہ دینی عقائد کے معاملے میں مودودی صاحب اور ان کی جماعت کے افکار و خیالات کی کمزوریاں میری طرح دوسرے بھائیوں کے سامنے آجائیں اور پھر انھیں بھی ان کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کا موقع مل سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ انبیاء کرام کی عصمت کے مسئلے میں گمراہی کی ابتدا مودودی صاحب نے خود نہیں کی ہے بلکہ انھوں نے یہ نظریہ دوسری جگہ سے اخذ فرمایا ہے۔

عصمتِ انبیاء کے سلسلے میں احمد امین مصری کی تحقیق

ماضی قریب کے ممتاز مصری

علماء اور مشہور انشا پردازوں میں احمد امین مصری کا نام محتاج تعارف نہیں ہے انھوں نے اپنی کتاب "ضحی الاسلام" کے تیسرے جز میں عصمتِ

انبیاء کے مسئلے پر بحث کی ہے چنانچہ انھوں نے بڑی جرأت و بیباکی سے کام لیتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ عصمتِ انبیاء کا یہ عقیدہ شیعوں کے ردِ عمل میں اہلسنت کے اندر پیدا ہوا ہے ورنہ صدرِ اول اور دورِ سلف میں اس عقیدے کا ہرگز وجود نہ تھا۔ فرماتے ہیں۔

بل ولا نعرف وصف العصمة اسند الی الانبیاء فی هذین العصرین وحتی القرآن الکریم لا یفهم منها دعوی العصمة لاحد من الناس۔
(ضحی الاسلام جزء ثالث صفحہ ۲۲۸)

بلکہ ہم کو تو اس دور یعنی صدرِ اول میں اس بات کا پتہ بھی نہیں ملتا ہے کہ انبیاء کرام کیلئے عصمت ثابت کی گئی ہو اور قرآن کریم کی رو سے تو کسی شخص کے لئے عصمت کا دعویٰ سمجھ میں نہیں آتا۔

یعنی احمد امین صاحب کے خیال میں یہ عقیدہ صریح قرآن کے خلاف ہے اور اس کا وجود صدر اول کے بعد شیعوں کے عصمتِ ائمہ کے ردِ عمل میں ہوا ہے اس کے بعد احمد امین صاحب نے تقریباً بارہ ۱۲ آیتیں منتخب کر کے اس بات کی دلیل میں پیش کیا ہے کہ یہ آیتیں عصمتِ انبیاء کے عقیدے سے انکار کرتی ہیں ان میں سے بعض آیتوں پر آئندہ صفحات میں تبصرہ کیا جائے گا۔

اس وقت احمد امین کے استدلال کی حقیقت ناظرین کے سامنے آجائے گی تفصیلی معلومات کے لئے ان آیتوں کی تفسیر اکابرِ اہل سنت

کی کتابوں میں دیکھنی چاہیئے تاکہ احمد امین کی مریضانہ ذہنیت اور کج فہمیوں کا پوری طرح اندازہ ہو سکے۔ بہر حال احمد امین صاحب نے اس خیال کا بار بار اعادہ فرمایا ہے کہ عصمتِ انبیاء کا عقیدہ صدر اول کے بعد محض شیعوں کی تقلید میں علماء اہلسنت نے ایجاد کیا ہے چنانچہ اس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

والغالب الظن ان بحث المتکلمین فی عصمة الانبیاء متاخر عن قولِ الشیعہ فی عصمة الامام (ضحی الاسلام ج ۳ ص ۲۳۱)

غالب گمان یہ ہے کہ متکلمین کا عصمتِ انبیاء کے مسئلے میں بحث کرنا عصمتِ ائمہ کے عقیدے کے بعد وجود میں آیا ہے۔

اپنے اس دعویٰ پر احمد امین صاحب نے کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کیا ہے بلکہ اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لئے انھوں نے تاریخی اسباب و وجوہ کے ذریعہ ظن و تخمین سے استدلال کرنے کی کوشش کی ہے۔ پوری بحث کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

فکان السنیون اذا رأوا الشیعہ ینسبون علماً وفضلاً لامامہم نسبوا مثلہ للانبیاء علی الاقل فغلا بعضہم فی القول بعصمة الانبیاء من الکبائر والصغائر قبل النبوة وبعدھا

تو اہل سنت نے جب یہ دیکھا کہ شیعہ حضرات ہر فضل و کمال کو کسی نہ کسی امام سے منسوب کر رہے ہیں تو انھوں نے بھی کم از کم انبیاء کرام سے متعلق ویسے ہی عقیدے بنائے حتیٰ کہ بعض سنیوں نے

وهو مخالف لصريح القرآن
(ضحی الاسلام صفحہ ۲۳۵/۳)

اس میں اس قدر غلو کیا کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں جملہ صغائر و کبائر سے بعد نبوت اور قبل نبوت عصمت حاصل نحو کے قائل ہو گئے حالانکہ یہ نظریہ صریح قرآن کے خلاف ہے۔

احمد امین صاحب نے اپنے اس خیال کی حمایت میں اکابر اہل سنت کی کتابوں سے نہ تو کوئی تائید حاصل کی ہے اور نہ ہی اسلامی کتبخانے کے ذخیرے میں تلاش و جستجو کے باوجود انھیں کوئی سہارا دستیاب ہو سکا ہے البتہ امام غزالیؒ کی ایک عبارت بے موقع نقل کر کے اس سے اپنا عقیدہ کشید کرنا چاہا ہے۔ امام غزالیؒ کی عبارت سے جو کچھ انھوں نے سمجھنا چاہا ہے اس پر تبصرہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم ان کے اس نظریئے کا جائزہ لیں کہ اس عقیدے کے بارے میں ان کا یہ بیان کہاں تک صحیح ہے کہ یہ عقیدہ صریح قرآن کے خلاف بھی ہے اور صدر اول کے بعد ایجاد کیا گیا ہے،

عصمت انبیاء کا عقیدہ صدر اول سے متوارث ہے

یہ کہنا کہ صحابہ کرامؓ کے دور میں انبیاء کرام کے لئے عقیدۂ عصمت کا پتہ نہیں ملتا ہے۔ مذہبی، تاریخ اور سیر کی کتابوں سے کامل بے خبری کی دلیل ہے اس لئے کہ اسلامی فرقوں کے نظریاتی اختلاف کی تاریخ پر غور کرنے سے یہ بات واضح

طریقہ پر سامنے آجاتی ہے کہ اس عقیدے کا صحابۂ کرام کے زمانے میں وجود تھا جیسا کہ آئندہ صفحات میں اسکی تفصیل پیش کیجائیگی۔

قرآن و حدیث سے قطع نظر کرکے محض تاریخ | اس بات کا تاریخی ثبوت موجود ہے

کی روشنی میں بھی ہم تلاش و جستجو کریں تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ یہ عقیدہ صحابہؓ کے درمیان اور ان کے بعد تابعین کے زمانہ میں بھی موجود تھا چنانچہ فرقہ ازارقہ جو خوارج کا ایک گروہ ہے اس کے متعلق علامہ آلوسی علیہ الرحمۃ کے حوالے سے یہ بات آنیوالی ہے کہ جمہور امت سے عصمت انبیاء کے مسئلے میں ازارقہ کو اختلاف تھا اور یہ فرقہ زمانۂ رسالت و نبوت میں بھی انبیاء کو کفر و شرک سے معصوم نہیں تسلیم کرتا ہے بلکہ علامہ شہرستانی نے اپنی مشہور کتاب "الملل والنحل" کے اندر تحریر فرمایا ہے، کہ فرقۂ ازارقہ صغائر و کبائر میں سے کسی گناہ سے بھی انبیاء کرام کے لئے عصمت کا قائل نہیں ہے۔ اب ایک بات یہ رہ جاتی ہے کہ یہ فرقہ کس دور میں پیدا ہوا اس کی تاریخ ولادت معلوم ہو جانیکے بعد یہ چیز خود سمجھ میں آجائے گی کہ عصمت انبیاء کا عقیدہ صدر اول میں موجود تھا کہ نہیں۔ اگر یہ بات مستند طریقے سے ثابت ہوجاتی ہے کہ فرقہ ازارقہ صحابہ ہی کے دور میں پیدا ہو چکا تھا اور اسی نے جمہور امت کے خلاف

عصمتِ انبیاء کا انکار کیا ہے تو پھر اس بات کے لئے کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہجاتی کہ احمد امین مصری کا سابق خیال درست تسلیم کرلیا جائے۔ فرقہ ازارقہ کی بنیاد نافع بن ازرق نے ڈالی ہے۔ تاریخوں سے یہ حقیقت بے غبار ہوکر سامنے آجاتی ہے کہ اس فرقہ کا بانی اور سربراہ اول یہی شخص تھا۔ چنانچہ تذکرہ نگار لکھتے ہیں۔

ھو نافع ابن ازرق الحروری من رؤس الخوارج والیہ تنسب طائفۃ الازارقۃ قتل فی جمادی الاخریٰ سنۃ ۶۵ھ ولہ اسئلۃ عن ابن عباس فی جزءٍ اخرج الطبرانی بعضھا فی مسند ابن عباس من المعجم الکبیر (حاشیہ الفوز الکبیر صفحہ ۱۸)	یہ نافع ابن ازرق حروری خارجیوں کا راس رئیس ہے اور فرقۂ ازارقہ اسی سے منسوب ہے یہ جمادی الاخریٰ ۶۵ھ میں قتل کیا گیا۔ حضرت ابن عباس اور اس شخص کے درمیان کچھ سوال وجواب بھی ہوئے ہیں جن کا بعض حصہ طبرانی نے معجم کبیر میں مسند ابن عباس کے ذیل میں نقل کیا ہے۔

اس عبارت سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ فرقۂ ازارقہ صحابۂ کرام کے زمانے میں ہی رونما ہوچکا تھا پھر اس کے بعد احمد امین مصری کا یہ کہنا کہ عصمتِ انبیاء کا نظریہ صحابہؓ کے دور میں موجود نہ تھا۔ مختلف اسلامی فرقوں کے عقائد اور ان کے صحیح تاریخی حالات سے بیخبری کا نتیجہ نہیں تو اور

کیا ہے اگر ہم بفرضِ محال یہ بات بھی تسلیم کریں کہ خاص بانیٔ فرقہ کی طرف
سے عصمتِ انبیاء کے مسئلے میں دورِ صحابہؓ کے اندر یہ اختلاف رونما نہیں
ہوا تھا بلکہ بعد میں بانیٔ فرقہ کے متبعین نے یہ اختلاف پیدا کر لیا تھا تو اس
کے باوجود دورِ صحابہ میں اس عقیدے کے موجود ہونے کا ثبوت فراہم
ہو جاتا ہے کیونکہ بانیٔ فرقہ اور اس کے متبعین کی مدت حیات کے بارے
میں جو کچھ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے ان سب کا حاصل یہی ہے کہ یہ فرقہ
زیادہ دن تک باقی نہیں رہ سکا اور قلیل عمری ہی میں اس فرقے کا خاتمہ
ہو گیا۔ اس تاریخی شہادت کے علاوہ خود یہ بات بھی غور کرنے کی ہے
کہ فرقے کا بانیٔ اول نافع بن ازرق ہے جس کی تاریخ انتقال جمادی الاخری
۶۵ھ بتائی گئی ہے۔ اور صحابہؓ کرام کا زمانہ کم از کم سو سال یعنی پہلی صدی
ہجری تک تسلیم کرنے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ سوچنے کی بات ہے
کہ اس قلیل العمر فرقے کے بانی نے اگر یہ اختلاف اپنی حیات کے اندر نہ
پیدا کیا ہو بلکہ اس کے متبعین نے عصمت انبیاء کے عقیدے سے اختلاف
ظاہر کیا ہو جب بھی نصف صدی سے کچھ کم کا لمبا عرصہ اس کے متبعین
کو ملتا ہے جس کے اندر اس اختلاف کا ظاہر ہو جانا نہ صرف قرین
قیاس بلکہ ایک یقینی امر ہے بنا بریں فرقۂ ازارقہ کا عصمتِ انبیاء کے
مسئلے میں جمہور صحابہ سے اختلاف کرنا ایک تاریخی حقیقت ہے۔

جس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ جمہور امت اور تمام صحابہؓ اگر اس وقت عصمتِ انبیاء کے قائل نہ ہوتے تو فرقۂ ازارقہ کا اس سے اختلاف کرنا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا اور نہ پھر مورخین کو اس اختلاف کے نقل کرنے کی کوئی ضرورت ہی پیش آتی لیکن اسلامی فرقوں کے نظریاتی اختلاف کی تاریخ میں اس فرقہ کا اس انداز میں تذکرہ پایا جانا اس کی واضح دلیل ہے کہ یہ فرقہ اس نظریئے کی وجہ سے امت کی عام شاہراہ سے چونکہ ہٹ چکا تھا اس لئے تاریخ نے اس فرقے کے عصمتِ انبیاء کے عقیدے سے اختلاف کرنے کو محفوظ کر لیا ہے پس تاریخ کے اس تفصیلی بیان کے بعد یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ عصمتِ انبیاء کا یہ عقیدہ صدرِ اول میں موجود تھا اور اس زمانہ میں جمہور امت کا یہی عقیدہ تھا۔

اس بات کا قرآن وحدیث سے بھی واضح ثبوت ملتا ہے

قرآن کی بعض آیات خاص عصمتِ انبیاءؑ کے مسئلہ میں بالکل صریح ہیں، اور وہ اپنے مفہوم ومراد میں بہت زیادہ واضح ہیں جن کا تذکرہ اپنے موقعہ پر آئندہ صفحات میں آرہا ہے لیکن ان آیتوں کے علاوہ کچھ ایسی آیتیں بھی ہیں جن سے بطور اشارہ اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ یہ عقیدہ صحابہؓ کرام کے دور ہی سے موجود ہے مثلاً حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق قرآن میں ہے۔

فظن ان لن نقدر علیہ — انھوں نے خیال کیا کہ ہم مواخذہ نہ کریں گے۔

یعنی حضرت یونس علیہ السلام نے اپنی سرکش قوم سے تنگ آکر یہ طے کر لیا کہ اب ان کے درمیان قیام نہ کرنا چاہیئے اور انھوں نے اس کے قبل ہی اپنی قوم کو چھوڑ دیا کہ اس سلسلے میں انھیں خدا کی طرف سے کوئی حکم ملتا۔ انھوں نے خیال کیا کہ ہمارا یہ اقدام بُرے لوگوں سے بیزاری اور برأت ظاہر کرتا ہے اس لئے اس پر کسی مواخذہ کا امکان نہیں ہے۔ بھی واقعہ کی طرف مذکورہ آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

پس لفظ نَقْدِرَ نَحْكُمَ کے معنیٰ میں ہے[1] لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے نقدر کو قدرت سے ماخوذ سمجھا جس کی وجہ سے آیت کا یہ مفہوم ہو گیا کہ حضرت یونسؑ نے خیال کر لیا کہ اللہ تعالیٰ ہم پر قدرت ہی نہیں رکھتے۔ ظاہر ہے کہ کسی پیغمبر کے بارے میں اس عقیدے کا تصور کرنا کہ وہ کسی موقعے پر بھی اپنے آپ کو خداوند تعالیٰ کی قدرت سے باہر سمجھتے ہوں سراسر ان کی عصمت کے منافی ہے۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ کے ذہن میں فوراً یہ بات کھٹکنے لگی کہ یہ معنیٰ جو آیت کے ظاہری الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے

[1] اس آیت کو احمد امین مصری نے عصمتِ انبیاء کے خلاف پیش کیا ہے۔ جواب حضرت ابن عباس کی وضاحت سے ظاہر ہے۔

انبیاء کرام کی عصمت کے سراسر خلاف ہے چنانچہ اس شبہے کی وجہ سے انھیں بڑی بے چینی ہوئی وہ حضرت ابن عباس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا شبہ ان کے سامنے پیش فرمایا۔ حضرت ابن عباس نے وضاحت فرمائی کہ اس آیت کے اندر لفظ "نقدر" قدرت سے مشتق نہیں ہے بلکہ اس کا ماخذ قدر ہے جو حکم کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے اس لئے آیت کا مفہوم انبیائے کرام کی عصمت کے منافی نہیں ہے اس واقعے میں اس بات کا واضح ثبوت موجود ہے کہ انبیاء کرام کی عصمت کا عقیدہ جمہور صحابہ میں معروف اور مسلّم تھا ورنہ حضرت معاویہؓ کا شبہ کرنا اور اس کے ازالہ کے لئے اس قدر فکر مند ہونا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا اور نہ حضرت ابن عباسؓ کے اس توضیح و وضاحت کی کوئی ضرورت پیش آتی۔ یہ واقعہ روح المعانی اور دوسری تفسیروں میں موجود ہے۔ تفسیر مدارک کے اندر مندرجہ ذیل الفاظ میں واقعہ کا تذکرہ ملتا ہے۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما	حضرت ابن عباس سے منقول ہے کہ
انہ دخل یوماً علیہ معاویۃ	ایکدن حضرت معاویہؓ ان کے پاس
وقال لقد ضربتنی امواج	تشریف لائے اور کہنے لگے گذشتہ
القرآن البارحۃ فغرقت فیھا	رات میں قرآن کی موجوں کے زد
فلم اجد لنفسی خلاصاً الا بک	میں پڑکر اسمیں غرق ہوگیا بس اپنے

وقال وما هي يامعاويہ فقرأ الأٰیۃ فقال او یظن نبی اللّٰہ ان لا یقدر وقال ھٰذا من القدرِ لا من القدرۃِ (مدارک صفحہ ۳۲.)

لئے آپ کے سوا اس سے نجات کی کوئی راہ نہیں پاتا ۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ واقعہ کیا ہے پھر حضرت معاویہؓ نے آیت پڑھ کر سوال پیش فرمایا کہ کوئی رسول یہ تصور کر سکتا ہے کہ وہ خدا کی قدرت سے باہر ہے؟ حضرت ابن عباسؓ نے ارشاد فرمایا اس آیت میں لفظ نَقْدِرَ قَدْرٌ سے ماخوذ ہے قدرت سے نہیں ۔

نیز اس عقیدہ سے متعلق جہاں تک احادیث کا تعلق ہے تو احادیث میں اس بات کا بڑا ذخیرہ موجود ہے کہ جس سے براہِ راست عصمتِ انبیاء کے عقیدے پر روشنی پڑتی ہے اور اس امر کا واضح ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ تمام صحابہ کرام انبیاء علیہم السلام کی عصمت کا عقیدہ رکھتے تھے اس سلسلہ کی بعض حدیثیں اپنے موقعہ پر نقل کی جائیں گی ۔ یہاں صرف ایک حدیث نقل کی جاتی ہے جو اس عقیدے پر پوری صراحت سے دلالت کرتی ہے ۔ مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتٰب والسنۃ کی فصل اول میں بخاری ومسلم کے حوالے سے یہ حدیث مذکور ہے

عن النبیؐ قال جاء ثلٰثۃ رھط الیٰ ازواج النبی صلی اللّٰہ علیہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ تین صحابہؓ حضور اکرم ﷺ کی

يسئلون عن عبادة النبي صلى الله عليه وسلم فلما اخبروا بها كانهم تقالوها فقالوا اين نحن من النبي صلى الله عليه وسلم قد غفر الله له ما تقدم من ذنبه وما تاخر (مشکوٰۃ ص۲۷ ج ۱)

ازواج مطہرات کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ حضورؐ کی عبادت کے متعلق کچھ دریافت کرنا چاہتے تھے جب انھیں اس کے متعلق بتایا گیا تو انھوں نے اپنے خیال میں اس کو کم سمجھا اور کہنے لگے ہم لوگوں کو حضورؐ سے کیا نسبت ہے اللہ نے انھیں اگلے پچھلے گناہوں کی معافی کا پروانہ عطا فرمایا ہے لہٰذا ہمارا ان سے کیا جوڑ)

حدیث کے آخری ٹکڑوں میں دو بات کی اچھی طرح وضاحت ملتی ہے پہلی بات تو یہ کہ اس جملے سے یہ چیز مترشح سمجھی جاتی ہے کہ صحابۂ کرام بالاجماع حضورؐ کی عصمت کا عقیدہ رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے یہ فرمایا کہ ہمارا ان سے کیا جوڑ ہے یعنی "چہ نسبت خاک را با عالم پاک" چنانچہ صحابۂ کرام کے اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے ملا علی قاریؒ تحریر فرماتے ہیں۔

فقالوا این نحن من النبي صلى الله عليه وسلم اي بيننا وبينه بون بعيد فانا على صدد

صحابۂ کرام نے کہا ہمارا حضورؐ سے کیا جوڑ ہے یعنی ہمارے اور ان کے درمیان بہت بڑا فرق ہے کیونکہ

التفريط وسوء العاقبة
وهو معصوم مامون الخاتمة
(مرقات ص۳۱ ج۱)

کیونکہ ہم سب کو انجام بد اور تقصور کا
خطرہ ہے اور آپ معصوم اور
مامون الخاتمہ ہیں۔

آگے چل کر مزید اسی سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

وقال بعض المحققين واجماع
الصحابة على التأسي به صلى الله
عليه وسلم في اقواله وافعاله
وسائر احواله حتى في كل حالة
من غير بحث ولا تفكر بل بمجرد
علمهم او ظنهم بصدور ذالك
منه دليل قاطع على اجماعهم
على عصمته وتنزهه على ان
يجري على ظاهره
او باطنه شيء لا يتأسى به
فيه مما لم يقم
دليل على اختصاصه
به۔

بعض محققین کا کہنا ہے کہ تمام صحابہؓ
کرامؓ کا بلا کسی پس وپیش کے ہر حالت کے
اندر آنحضرتؐ کے تمام احوال اعمال
واقوال اور جملہ معاملات میں آپؐ
کی پیروی کرنے پر اجماع کر لینا
بلکہ ان اقوال واعمال کے صادر ہونے
کا یقین یا گمانِ غالب حاصل ہو جانے
کی وجہ سے واجب الاتباع
ہونے پر صحابہؓ کا اجماع کر لینا
اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ وہ سب
آنحضرتؐ کی عصمت کے قائل تھے
اور آپؐ کی ذات کے لئے مخصوص
ہونے کی دلیل نہ پانے کی صورت میں

(مرقات صفحہ ۱۸۱/۱۲۰) کوئی ایسی چیز جو لائق پیروی نہ ہو اس سے

. . . . . آپؐ کے ظاہر و باطن کو پاک مانتے تھے

اس حدیث کی تشریح کو پڑھ لینے کے بعد ناظرین کے لئے اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کوئی تردد نہ ہونا چاہیے کہ صحابۂ کرامؓ بلا کسی اختلاف کے عصمتِ انبیاء کرامؑ کا عقیدہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی امر کے متعلق جب انھیں یہ یقین ہو جاتا تھا یا اس بات کا گمان غالب ہی ہو جاتا کہ یہ چیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے تو کسی تأمل اور کسی غور و فکر کے بغیر اپنے لئے نمونہ تصور کرتے تھے کیونکہ جملہ اعمال و افعال میں آنحضرتؐ کی زندگی کو اللہ تعالیٰ نے واجب الاتباع قرار دیا ہے چنانچہ فرمایا گیا۔

لکم فی رسول اللہ — رسولِ خدا کے اندر تمھارے لئے

اسوۃ حسنۃ — کامیاب نمونہ موجود ہے۔

صحابۂ کرام اس آیت کے حقیقی مفہوم کو اچھی طرح سمجھتے تھے اس لئے وہ آنحضرتؐ کی عصمت ماننے پر مجبور تھے کیونکہ اگر آپؐ کو معصوم نہ مانا جائے اور گناہ کا وقوع آپؐ سے بھی جائز مان لیا جائے تو پھر لازم آئیگا کہ یا تو آپؐ کی اس گناہ میں بھی پیروی کی جائے اور یا پھر آپؐ کی ساری زندگی کو ہر موقعہ پر نمونہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جائے۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں بداہۃً غلط ہیں۔

حدیث مذکور کے آخری جملے سے دوسری بات یہ بھی بالکل صاف طریقے سے معلوم ہوتی ہے کہ صحابۂ کرام قرآن شریف کی اس آیت کو عصمت کے خلاف نہ سمجھتے تھے یعنی اللہ کا یہ ارشاد۔ لیغفر اللہ لک ماتقدم من ذنبک وما تاخر لہ

صحابۂ کرام کے نزدیک عقیدۂ عصمت کے خلاف ہرگز نہ تھا بلکہ ان کے خیال میں اسی آیت سے عقیدۂ عصمت کا ثبوت نکلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث مذکور کے آخری جملہ میں انھوں نے آنحضرت صلعم کی بے گناہی پر اسی آیت سے استدلال کیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آیت مذکور کے اندر اگلے گناہوں کے بخشنے کا ذکر ہے جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ گناہوں کا وقوع ان سے ہو چکا ہے۔ اس لئے کہ اگر گناہ واقع ہی نہ ہوتا تو مغفرت کس چیز کی کی جاتی۔ یہ استدلال بالکل غلط ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کا جو معنیٰ و مفہوم صحابۂ کرام سے منقول ہے اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توثیق حاصل ہے لہٰذا خداوند تعالیٰ کی مراد بھی وہی ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعۂ وحی اگر صحابۂ سے غلط فہمی ہوئی ہوتی تو اس کا ازالہ کر دیا جاتا باقی رہی یہ بات کہ گناہ

لہ اس آیت سے عصمت کے خلاف احمد امین مصری نے استدلال کیا ہے جواب تفصیل مذکور سے ظاہر ہے۔

کا وقوع اگر ہوتا ہی نہیں تو مغفرت کس چیز کی ہوتی اور لفظ گناہ کا اطلاق کس حقیقت پر کیا گیا تھا تو اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ اکابر مفسرین نے آیت کے تحت مختلف جوابات تحریر فرمائے ہیں جس کے بعد تمام شبہات کالعدم ہو کر رہ جاتے ہیں میں اس جگہ ان میں سے صرف دو جواب نقل کرنا کافی سمجھتا ہوں ۔ ملا علی قاریؒ نے حدیث کے آخری ٹکڑے کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے ۔

ثم الذنب مالم تبعة دینیة او دنیویة ماخوذ من الذنب ولما کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم معاتبًا بترک الاولیٰ تاکیدًا للعصمة اطلق علیه اسم الذنب او یکون من باب حسنات الابرار سیئات المقربین۔ قال ابن حجر ای ستر بینه وبینه بعصمة منه فلم یمکن صدوره منه

گناہ اس کو کہتے ہیں کہ جس پر آخرت یا دنیا میں کوئی مواخذہ مرتب ہو یہ لفظ ذنب سے ماخوذ ہے چونکہ آنحضرت صلی اللہ سے خلاف اولیٰ عمل کے صادر ہونے پر عصمت میں قوت پیدا کرنے کے لئے مواخذہ ہوتا تھا اس لئے اس پر گناہ کا لفظ اطلاق کیا گیا یا اس لئے کہ اچھے لوگوں کی نیکیاں بھی مقربین کے لئے قصور کا درجہ رکھتی ہیں (مشہور ہے کہ مقرباں را بیش بود حیرانی)

ولو صغيرة قبل	ابن حجر کہتے ہیں کہ گناہ معاف کرنے
النبوة على الاصح	کا یہ مطلب نہیں ہے کہ گناہ واقع ہونے
هذا معنى المغفرة	کے بعد معاف کیا گیا بلکہ مطلب یہ ہے
فى حق الانبياء	کہ گناہ اور پیغمبر کے درمیان خدا نے
ومعناها فى غير	ایک پردہ حائل کردیا۔ اس لئے اس سے
هم ستر بينهم	کسی گناہ کا واقع ہونا قول صحیح کے
وبين عقوبة	مطابق ممکن ہی نہیں ہے اگرچہ قبل
ذنوبهم۔	نبوت ہو اور صغیرہ ہی کیوں نہ ہو
(مرقات)	انبیاء کے حق میں مغفرت کا یہی
صـ۱۸۱ ج ۱	معنٰی ہوتا ہے ان کے علاوہ دوسروں
. . . .	کے حق میں مغفرت کا معنٰی یہ ہے کہ
. . . .	ان کے درمیان اور ان کے گناہوں کی
. . . .	سزا کے درمیان ایک پردہ حائل کردیا جائے

مُلا علی قاری کے اس بیان سے یہ بات اصولی طور پر سمجھ میں آگئی ہو گی کہ انبیاء کرام علیہم السلام کیلئے جہاں جہاں بھی مغفرت کرنے کا تذکرہ ملتا ہے وہاں اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ان کی ذوات مقدسہ اور گناہوں کے درمیان رکاوٹ قائم کر دی گئی ہے تاکہ کسی گناہ کا

صدور نہ ہوسکے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ان سے گناہوں کا صدور ہو چکا ہے مگر ان کی سزائیں معاف کر دی گئی ہیں نیز ملا علی قاری کے اس بیان سے یہ چیز بھی معلوم ہوگئی کہ قرآن وحدیث میں انبیاء کرام کے کسی عمل کو اگر گناہ سے تعبیر کیا گیا ہے تو وہ گناہ کے حقیقی معنیٰ میں نہیں ہے جس پر دنیا و آخرت میں کسی سزا کا مرتب ہونا لازم آئے بلکہ کسی خلافِ اولیٰ اور ایسے امر پر لفظ گناہ کا اطلاق کیا گیا ہے جو ان کے حق میں شایانِ شان نہ تھا یعنی وہ امر جسکو گناہ کہا گیا ہے درحقیقت اجتہاد اور رائے کی غلطی ہے جس پر نہ تو کسی سزا کا ترتب ہوتا ہے اور نہ ہی وہ چیز حقیقتاً گناہ ہوتی ہے کہ اس کو عصمت کے منافی سمجھا جائے بلکہ گناہ کے بجائے ان کو اس فعل پر ایک اجر ملتا ہے کیونکہ انھوں نے اپنی وسعت خدا کی مرضی تلاش کرنے میں خرچ کی ہے اور امکانی کوشش سے باز نہیں آئے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی کسی لغزش کے سبب نہ تو ان کے اندر فسق کا وجود ماننا صحیح ہے اور نہ اس کی وجہ سے ان کی عصمت اور عدالت وثقاہت میں کوئی فرق پیدا ہوتا ہے چنانچہ اہلسنت والجماعت کے اکابر نے مندرجہ ذیل اصول میں اسی بات کی وضاحت کی ہے. علامہ آلوسیؒ تحریر فرماتے ہیں.

فلان العدالة لاتنافی	پس (عصمت و) عدالت کے منافی
الخطأ فی الاجتهاد اذ لا	اجتہاد کی غلطی نہیں ہوسکتی کیونکہ اجتہاد

فتن فيه كيف در المجتهد المخطئ ماجور.
(روح المعانی صفحہ ۴۴ جلد ۲)

غلطی کسی گناہ کا نام نہیں ہے اور اسے گناہ کیونکر کہا جا سکتا ہے جب کہ اس غلطی کا مرتکب ہونے والا اجر و ثواب کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

یہ تفصیل اس جواب کا حاصل ہے جو ملا علی قاریؒ کے حوالے سے اوپر نقل کیا گیا لیکن اسی شبہ سے متعلق ایک دوسرا جواب یہ بھی ہے جس کا تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

و در توجیہ غفرانِ ذنوب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہ قرآن مجید بر آں ناطق است اقوال است بہترین اقوال آنست کہ ایں کلمہ تشریف است مر آنحضرت را از جانب مولیٰ تعالیٰ بے آنکہ ذنب وجود داشتہ باشد چناں کہ صاحب مر بندۂ خود را بگوید کہ گناہانِ ترا بخشیدم۔ تو فارغ البال باش و ہیچ اندیشہ مکن اگرچہ آں بندہ گناہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گناہوں کی مغفرت جس پر قرآن ناطق ہے اس کی توجیہ میں بہت سے اقوال ہیں ان سب میں بہتر قول یہ ہے کہ یہ عزت افزائی کا حیلہ ہے جو خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خداوند تعالیٰ کی طرف سے بطور شرف عطا کیا گیا ہے اس کے بغیر کہ آپ کے لئے کسی گناہ کا وجود مانا جائے جیسے کہ آقا اپنے غلام سے کہتا ہے تم فکر نہ کرو اور بالکل

نہ داشتہ باشد۔ (اشعۃ اللمعات صفحہ ۱۳۷ ج ۱ ۱۳۸)

مطمئن رہو تمھارے گناہ ہم نے معاف کر دیئے اگرچہ (اس وقت تک) غلام سے کوئی گناہ بھی وقوع میں نہیں آیا ہو۔

یعنی جس طرح بڑے لوگ اپنے چھوٹوں کی عزت افزائی اور طیب خاطر کے لئے اپنے تعلق و محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں جاؤ تمھارے سب قصور معاف کر دیئے حالانکہ اس بیچارے سے کوئی قصور بھی نہیں ہوا ہوتا لیکن پھر بھی یہ جملہ محاورے میں درست سمجھا جاتا ہے اور جس کے حق میں استعمال کیا گیا ہے وہ اس جملے کو اپنے لئے باعثِ شرف تصور کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے جملوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ شرف عطا فرمایا ہے اور آپؐ سے اپنے غایت تعلق و محبت کا اظہار فرمایا ہے۔

احمد امین مصری کا استدلال غلط ہے

گذر چکا ہے کہ احمد امین مصری صاحب نے عصمتِ انبیاءؑ کے عقیدے کو دورِ صحابہ کے بعد کی ایجاد قرار دیا ہے اور اس عقیدے کو صریح قرآن کے خلاف بتایا ہے لیکن جہاں تک اپنے اس دعوے کے حق میں ثبوت فراہم کرنے کا تعلق ہے تو احمد امین صاحب نے اس پر نہ کسی قابل اعتماد شخص کی کوئی تائید نقل کی ہے اور نہ ہی اسلامی کتابوں

کے ذخیرے میں تلاش و جستجو کے باوجود انھیں کوئی ایسی چیز دستیاب ہو سکی ہے جسکو وہ اپنے دعویٰ کے لئے بطور دلیل پیش کر سکتے۔ بڑی کد و کاوش کے بعد امام غزالیؒ کی ایک عبارت کو مفید مطلب سمجھتے ہوئے انھوں نے بے جگہ استعمال کر کے اس سے اپنا عقیدہ کشید کرنا چاہا ہے۔ چنانچہ بڑے فخر کے ساتھ لکھتے ہیں۔

ويعجبني في ذالك قول الغزالي في التوبة دليل في الوجود أدمي الا و شهوته سابقة وغريزته التي هي عدة الشيطان متقدمة على غريزته التي هي عدة الملئكة فكان الرجوع اليه على مساعدة الشهوات ضرورتا في حق كل انسان نبيا كان او غبيا فلا تظن ان هذه الضرورة

امام غزالیؒ کا قول جو توبہ کے متعلق انھوں نے لکھا ہے وہ مجھے بے حد پسند آیا وہ یہ کہ وجود میں کوئی آدمی نہیں مگر یہ کہ شہوت اس کے اندر عقل کی آمد سے پہلے ہی پائی گئی ہے اور وہ فطری مادے جو شیطانی وسائل ہیں انسان کی ان قوتوں پر جو فرشتگانہ ہیں مقدم ہوتے ہیں لہٰذا جو شہوانی تقاضے کی موافقت کا جذبہ انسان میں پہلے سے موجود ہے اس سے رجوع کرنا ہر شخص کے لئے ضروری ہوگا چاہے نبی ہو یا

اختصت بآدم علیہ السلام۔	عنی بنا بریں ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ توبہ ورجوع کی ضرورت صرف آدمؑ کے لئے خاص ہے۔
ولہذا قال علیہ السلام انہ لیغان علیٰ قلبی حتیٰ استغفر اللہ فی الیوم و اللیلۃ سبعین مرۃ۔ (ضحی الاسلام صفحہ ۲۳۰)	اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بلاشبہ میرے قلب پر ابر (غفلت) چھا جاتا ہے حتیٰ کہ میں دن رات میں ستر مرتبہ خدا سے استغفار کرتا ہوں۔

کتاب کے حاشیہ میں احمد امین صاحب "اختصت بآدم علیہ السلام" کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

یشیر الیٰ قولہ تعالیٰ وعصیٰ آدم ربہ فغویٰ ثم اجتباہ ربہ فتاب علیہ وھدیٰ (حاشیہ ضحی الاسلام صفحہ ۲۳۰ ج ۲)	یعنی امام غزالیؒ کا اشارہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف ہے آدمؑ نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور بھٹک گئے پھر خدا نے ان کا انتخاب کیا اور ان کی توبہ قبول کی اور رہنمائی فرمائی۔

اس جگہ بھی احمد امین مصری صاحب اپنی کجروی اور غلط فہمی

کی وجہ سے یا تو خود فریب کا شکار ہوئے ہیں یا پھر انھوں نے قصداً دوسروں کو فریب دینا چاہا ہے اس لئے کہ آیت مذکورہ بالا کی طرف امام غزالیؒ کا اشارہ ہرگز نہیں ہے جیسا کہ احمد امین صاحب ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں بلکہ امام غزالیؒ کا اشارہ درج ذیل مشہور آیت کی طرف ہے جسمیں آدم علیہ السلام کے اعتراف اور توبہ و رجوع کی صراحت بھی پائی جاتی ہے اس کے برخلاف یہ باتیں گزشتہ آیت میں موجود نہیں ہیں بلکہ اس آیت میں تو صرف واقعہ کا بیان اور حکایت کی نقل کا تذکرہ ہے وہ آیت مشہور یہ ہے۔

ربنا ظلمنا انفسنا وان	اے ہمارے رب ہم نے اپنے
لم تغفر لنا وترحمنا	اوپر ظلم کرلیا ہے اگر تو معاف نہ
لنکونن من	کریگا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو
الخاسرین ○	ہم خاسرین میں شمار ہونگے۔

لیکن اس آیت میں چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کے توبہ کرنے اور مغفرت کی درخواست کرنے کا ذکر ہے احمد امین صاحب کو حضرت آدم کی طرف عصیان و غوایت کی نسبت اس کے اندر نہیں مل سکتی تھی جس سے وہ اپنا عقیدہ ثابت کرسکتے اس لئے انھوں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ امام غزالیؒ کا اشارہ اس آیت کی طرف موڑ دیا جو بظاہر

ان کے خیال میں آدم علیہ السلام کی طرف غوایت و عصیان کے نسبت کی وجہ سے عصمت انبیاؑ کے خلاف معلوم ہو رہی تھی بایں ہمہ اصولاً امام غزالیؒ کی اس عبارت کا مقصود بھی وہ نہیں ہے جو احمد امین مصری صاحب ناظرین کے ذہن میں اتارنا چاہتے ہیں جیسا کہ امام غزالیؒ کی اس عبارت کے متعلق آئندہ صفحات میں تفصیلی نقد و تبصرہ سے واضح ہو جائیگا ان باتوں کے علاوہ ایک بنیادی بات سوچنے کی یہ بھی ہے کہ امام غزالیؒ کا یہ بیان کہ خواہشاتِ نفس کے تقاضے اور شیطانی قوتوں کا تسلط ہر انسان کے اندر خیر و صلاح کی آمد سے پہلے ہی پایا جاتا ہے۔ بالخصوص انبیاء کرام کے سلسلہ میں ان کی یہ تحقیق اور اس پر حدیث "انہ لایغان علی قلبی" سے استدلال کرنا کسی طرح سے درست نہیں ہے جیسا کہ اس مسئلہ کی تحقیق ناظرین کے سامنے آئندہ پیش کی جانیوالی ہے اس وقت امام غزالیؒ کے اس نظریئے کی کمزوری واضح کر دیجائیگی مختصراً اس حدیث کے متعلق اتنی بات یہاں بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ نہ تو اس حدیث میں خیر و صلاح کی آمد سے پہلے قوتِ شر کے موجود ہونے کا کوئی تذکرہ ہے اور نہ ہی عقیدہ و عمل کی کسی خرابی کا ذکر ہے اس لئے اس حدیث کے ذریعہ نہ تو امام غزالیؒ کا نظریہ ثابت ہوتا

سے ہے اور نہ احمد امین مصری صاحب کا عصمتِ انبیا کے خلاف استدلال کرنا ہی درست ہوتا ہے کیونکہ حدیث کا صاف اور واضح مطلب صرف یہ ہے کہ انسانی قلب کی کیفیت ہمیشہ یکساں نہیں رہتی بلکہ مختلف حالات اور اوقات میں قبض و بسط، غفلت و بیداری اور انشراح وانقباض کی مختلف کیفیات اس پر طاری ہوتی رہتی ہیں اس طرح قلب پر مختلف کیفیتوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے پس بسط و انشراح کی کیفیتوں کا زائل ہو جانا اور اس کی جگہ قبض و غفلت کی کیفیتوں کا آجانا گو یا پہلی کیفیت کے درمیان دوسری کیفیت اور غفلت نکا حائل ہو جاتی ہے یہ چیز تمام انسانوں میں ایک فطری امر ہے جس سے کوئی فرد بشر بچ نہیں سکتا۔ بنا بریں پہلی کیفیت کے حصول و اعادہ کے لئے اور دوسری کیفیت سے پیدا شدہ ابر غفلت کو زائل کرنے کی غرض سے توبہ استغفار کرنا ایک دوسری چیز ہے اور اس سے قوتِ شر کے مقدم ہونے یا کسی نبی کے غیر معصوم ہونے پر استدلال کرنا بالکل دوسری بات ہے۔ دونوں باتوں کے اندر بہت واضح اور عظیم فرق ہے جسکو محسوس نہ کرنا سراسر زیادتی اور کج فہمی ہے۔ بہر حال احمد امین مصری صاحب نے انبیاء کرام کی عصمت کے سلسلہ میں جو خیال ظاہر کیا تھا اسی سے متاثر ہو کر ہند و پاک کے مشہور مصنف ابوالاعلیٰ مودودی

صاحب نے بھی عصمت انبیاؑ کے متعلق اسی انداز کے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔

عصمت انبیاؑ اور سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

جو لوگ مودودی صاحب کے انداز فکر اور طریق مطالعہ سے واقف ہیں انھیں اس بات کے باور کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا کہ احمد امین مصری صاحب سے ہی انھوں نے اس مسئلہ میں اثر قبول کیا ہے اور بلاشبہ مودودی صاحب نے عصمتِ انبیاؑ کے مسئلہ میں احمد امین مصری صاحب ہی کے اندازِ فکر سے کام لیا ہے بلکہ کوئی عجب نہیں کہ مودودی صاحب نے احمد امین مصری کی کتاب مذکور سے براہ راست اس نظریہ میں استفادہ کیا ہو بہر صورت معاملہ جو بھی ہو مودودی صاحب بھی عصمتِ انبیاؑ کے مسئلہ میں اسی راہ پر چلے ہیں جس کی رہنمائی ان سے قبل احمد امین مصری صاحب کر چکے ہیں چنانچہ مودودی صاحبؒ فرماتے ہیں۔

۱ عصمت دراصل انبیاء علیہم السلام کے لوازمِ ذات سے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب نبوت و رسالت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے مصلحتاً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمایا ہے۔

۲ ورنہ اگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت تھوڑی دیر کے لئے بھی ان سے منفک ہوجائے تو جس طرح عام انسانوں سے بھول چوک اور غلط فہمی ہوجاتی ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام سے بھی ہوسکتی ہے۔

۳ اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اٹھا کر ایک دو لغزش سرزد ہونے دی ہے۔

۴ تاکہ لوگ انبیاء علیہم السلام کو خدا نہ سمجھیں اور جان لیں کہ یہ بشر ہیں خدا نہیں ہیں (تفہیمات صفحہ ۴۳ جلد ۲)

چونکہ مذکورہ عبارت انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے مسئلہ میں مودودی صاحب کے بنیادی نظریئے کی وضاحت کرتی ہے اس لئے بڑی احتیاط اور دیانت داری کے ساتھ یہ عبارت حرف بحرف ان کی کتاب تفہیمات جلد دوم صفحہ ۴۳ سے نقل کی گئی ہے۔

عبارت کے تمام جملوں پر نمبرات قائم کرنے کی غرض سے اس کو چار حصوں میں تقسیم کرلیا گیا ہے تاکہ ہر جملے پر الگ الگ تبصرہ کیا جاسکے اور ناظرین کے لئے سہولتِ فہم کا ذریعہ بنجائے۔ مودودی صاحب کی اس عبارت سے عصمتِ انبیاء کے مسئلہ میں ان کا بنیادی نظریہ واضح ہوجاتا ہے اس پر جب بحث و تنقید کی جاتی ہے تو ان کے بعض

ہوا خواہوں اور معتقدین کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ مودودی صاحب کی یہ عبارت اپنے مفہوم میں مجمل اور ناقص ہے اور اس بات کے باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ مودودی صاحب نے اس عبارت میں جو بات کہنا چاہا ہے وہ پوری طرح صاف نہیں ہو پائی ہے اس لئے ان کی اس عبارت کا مقصود انھیں کی درج ذیل تشریح کو سامنے رکھ کر متعین کرنا چاہیئے۔ بنا بریں ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم کسی گفتگو کو شروع کرنے سے پہلے مودودی صاحب کی تشریحی عبارت کو بھی نقل کر دیں۔ وہ تشریحی عبارت سوال وجواب کی شکل میں جس طرح ان کی اصل کتاب میں ہے بلفظہٖ نقل کی جاتی ہے۔

سوال:۔ یہ امر مسلم ہے کہ نبی معصوم ہوتے ہیں مگر آدم علیہ السلام کے متعلق قرآن کے الفاظ صریحًا ثابت کر رہے ہیں کہ آپ نے گناہ کیا اور حکم عدولی کی جیسے ولا تقربا ھٰذہ الشجرۃ فتکونا من الظالمین کی آیت ظاہر کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں اپنی تحقیق کے نتائج سے مستفید فرمائیں۔

جواب:۔ نبی کے معصوم ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فرشتوں کی طرح اس سے بھی خطا کا امکان سلب کر لیا گیا ہے بلکہ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ نبی اول تو دانستہ نافرمانی نہیں کرتا اور اگر اس سے غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس غلطی پر قائم نہیں رہنے دیتا۔ پھر یہ بات

بھی لائق غور ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے جو نافرمانی سرزد ہوئی تھی وہ نبوت کے منصب پر سرفراز ہونے سے پہلے کی ہے اور قبل نبوت کسی نبی کو وہ عصمت حاصل نہیں ہوئی جو نبی ہونے کے بعد ہوا کرتی ہے۔ نبی ہونے سے پہلے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی ایک بہت بڑا گناہ ہوگیا تھا کہ انھوں نے ایک انسان کو قتل کر دیا۔ چنانچہ جب فرعون نے ان کو اس فعل پر ملامت کی تو انھوں نے بھرے دربار میں اس بات کا اقرار کیا کہ فعلتہا اذاً وانا من الضالین (الشعراء) یعنی یہ فعل مجھ سے اس وقت سرزد ہوا جب راہِ ہدایت مجھ پر کھلی نہیں تھی۔ مختصراً یہ بات اصولی طور پر سمجھ لیجئے کہ نبی کی معصومیت فرشتے کی سی معصومیت نہیں ہے کہ اسے خطا اور غلطی اور گناہ کی قدرت ہی حاصل نہ ہو بلکہ وہ اس معنیٰ میں ہے کہ نبوت کے ذمہ دارانہ منصب پر سرفراز کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ بطور خاص اس کی حفاظت و نگرانی کرتا ہے اور اسے غلطیوں سے بچاتا ہے اور اگر کوئی چھوٹی موٹی لغزش اس سے سرزد ہو جاتی ہے تو وحی کے ذریعہ سے فوراً اس کی اصلاح کر دیتا ہے تاکہ اس کی غلطی ایک پوری امت کی گمراہی کی موجب نہ بن جائے (ترجمان القرآن رجب شوال ۱۳۶۳ھ جولائی اکتوبر ۱۹۴۴ء) از رسائل و مسائل حصہ اول صفحہ ۲۵ طبع اول اگست ۱۹۶۰ء)

مودودی صاحب کے عقائد وافکار ان عبارتوں کے ذریعہ سامنے آجانے

کے بعد ضروری ہو جاتا ہے کہ ان کے خیال کی کمزوریوں کی نشاندہی کر دی جائے اور یہ واضح کر دیا جائے کہ ان کا نظریہ اہلسنت والجماعت کے متفقہ عقیدہ سے کس قدر مختلف ہے اور اس کے دور رس نتائج اور نقصان دہ پہلو کیا کیا ہیں لیکن ان باتوں کا سمجھنا جب ہی ممکن ہے کہ پہلے اصل مسئلے کی تمام تفصیلات معلوم ہو جائیں اور اس عقیدے سے متعلق اہل سنت والجماعت کا جو موقف ہے اس کو روشنی میں لایا جائے تاکہ آسانی کے ساتھ ناظرین اس اختلاف کی نوعیت کو سمجھ سکیں۔ بنابریں سب سے پہلے عصمت کا معنیٰ و مفہوم اور اہلسنت کے نزدیک جو اس لفظ کی تعریف و حقیقت ہے اس کو تحریر کر دینا ضروری ہے چنانچہ حوالوں کے ساتھ عصمت کی تعریف پیش خدمت ہے۔

عصمت کا مطلب کیا ہے

علامہ محب اللہ بہاری مسلم الثبوت میں اور علامہ عبد العلی بحر العلوم اس کی شرح فواتح الرحموت میں رقمطراز ہیں۔

وهی عدم قدرة المعصية عند البعض ونسبة بعض الروافض الى الشيخ ابى الحسن الاشعری قدس سرہ او هی خلق مانع عن ارتکاب المعصية غير ملجئ	یہ عصمت بعض لوگوں کے خیال میں معصیت پر قدرت نہ ہونے کے مرادف ہے بعض رافضیوں نے اس خیال کو شیخ ابوالحسن اشعریؒ کی طرف منسوب کر دیا ہے (حالانکہ ان کا یہ مسلک نہیں ہے دیکھئے شرح مواقف) یا یہ عصمت ایسی فطری خصلت

حتیٰ لا یکون المعصوم مضطرًا فی ترک المعصیۃ وفی فعل الواجب وھو المختار عند الجمھور۔
(فواتح الرحموت صفحہ ۳)

ہے جو معصیت کے ارتکاب سے روکتی ہے مگر بے اختیار نہیں بنا دیتی کہ معصوم گناہ سے پرہیز کرنے یا کسی واجب العمل کام کے کرنے پر مجبور اور بے بس سمجھا جائے جمہور (اہلسنت اشاعرہ و ماتریدیہ) کا مسلک مختار یہی ہے۔

عصمت کے مفہوم کے سلسلہ میں دو نقطہائے نظر ہیں۔ پہلا نقطۂ نگاہ شیعہ اور بعض معتزلہ کا ہے وہ یہ کہ کسی کے معصوم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کسی قسم کے گناہ کرنے کی اس میں قدرت ہی نہیں ہے گویا سلبِ امکان اور بے قدرتی ہی کا دوسرا نام عصمت ہے۔ اس کے برخلاف اہلسنت والجماعت کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ بے قدرتی اور سلب امکان کا نام عصمت نہیں ہے بلکہ جملہ معاصی کے ارتکاب کی صلاحیت اور اس پر مکمل قدرت و اختیار ہونے کے باوجود معصوم کبھی بھی کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا ہے گویا معصومیت بے اختیاری کا نام نہیں ہے بلکہ اختیار و قدرت کے باوجود بے گناہی کا نام معصومیت ہے اور یہ پیدائشی خصلت جو گناہ سے باز رکھتی ہے اسی کو عصمت کہتے ہیں۔ حاشیہ نبراس میں ہے۔

العصمۃ ان لا یخلق اللہ فی

عصمت یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ بندے کو

العبد الذنب مع بقاء قدرته و اختیاره (حاشیہ نبراس صفحہ ۲۳) | بے گناہ رکھے اگرچہ بندہ کا اس کے ارتکاب پر قدرت و اختیار باقی ہو۔

علم عقائد کی مشہور کتاب شرح فقہ اکبر میں ملا علی قاریؒ تصریح فرماتے ہیں۔

اختلف الناس فی کیفیۃ العصمۃ فقال بعضہم ھی محض فضل اللہ تعالیٰ بحیث لا اختیار للعبد فیہ وذالک انما بخلقھم علی الطبع یخالف غیرھم بحیث لا یمیلون الی المعصیۃ ولا ینفرون عن الطاعۃ کطبع الملٰئکۃ وامّا بصرف ھمتھم عن السیئات وجذبھم الی الطاعات جبراً من اللہ تعالیٰ بدء ان اودع فی طبائعھم ما فی طبائع البشر

لوگ عصمت کی کیفیت میں مختلف الخیال ہیں بعض کہتے ہیں کہ محض عطیہ خداوندی ہے جس میں بندے کے اختیار کی کوئی گنجائش نہیں ہے پھر یہ لوگ عصمت کی تعبیر میں دو گروہ ہو گئے اور یہ اس طرح حاصل ہوتا ہے کہ معصوموں کی تخلیق ہی ایسے مزاج پر مانی جائے جو ان کے علاوہ دوسروں سے بالکل جدا ہو کہ معصیت کی طرف توجہ کرنا اور طاعت سے بے توجہی برتنا ان کے بس ہی میں نہ رہے جیسے کہ فرشتوں کا مزاج ہے اور یا پھر یہ کہا جائے کہ جو باتیں دوسری انسانی طبیعتوں میں پائی جاتی ہیں وہ تو

وقال بعضهم العصمة
فضل من الله ولطفه و
لكن على وجه يبقى
اختيارهم بعد العصمة
في الاقتدار على الطاعة
والامتناع عن المعصية
واليه مال الشيخ
ابو منصور الماتريدي
حيث قال العصمة
لاتزيل المحنة
اي الابتلاء و
الامتحان يعني لا
تجبره على فعل الخير
ويزجره عن الشر
مع بقاء الاختيار
تحقيقا للابتلاء والاختيار
(شرح فقہ اکبر لجبتائی صفحہ ۲)

ان معصوموں میں بھی موجود ہیں مگر اس
کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کا مزاج
خیر کی طرف مائل کر کے سیئات سے
زبردستی روک رکھا ہے کہ اب وہ بے
اختیار ہو گئے ہیں اور بعض لوگوں کا خیال
ہے کہ عصمت خداوند تعالیٰ کا فضل وعطیہ
تو ضرور ہے لیکن اس کی صورت
کہ خیر پر اقدام کرنے اور معصیت
رہنے کا ان کے اندر اختیار . . ہے
اسی نظریہ کی طرف شیخ ابو منصور ماتریدی
کا رجحان ہے کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ عصمت
تکلیف یعنی امتحان وآزمائش کا امکان
ختم نہیں کر دیتی ہے مطلب یہ ہے
کہ معصوم کو نیک کام کرنے پر عصمت مجبور
نہیں کرتی لیکن برائی سے روکتی
ہے اگرچہ ارتکاب کی قدرت باقی رہتی
ہے تاکہ امتحان وآزمائش کا تحقق ہو سکے

شرح فقہ اکبر کے اس طویل اقتباس کا حاصل یہ ہے کہ عصمت کی حقیقت سے متعلق بنیادی طور پر دو قسم کے خیال ہیں۔ اول یہ ہے کہ عصمت اگرچہ بہ اعطائے الٰہی حاصل ہونیوالی ہی نعمت ہے لیکن اس کے حاصل ہوجانے کے بعد بندہ میں گناہ کرنے کی قدرت باقی نہیں رہتی۔ گویا عصمت معصوم کے مسلوب القدرت یا قدرت سے محروم ہو جانے کا نام ہے پھر اس سلب امکان اور بے اختیاری کے جو لوگ قائل ہیں ان کے دو گروہ ہیں۔ کچھ لوگ تو اس بات کے قائل ہیں کہ معصوم کی ذات فطری طور پر ان صلاحیتوں سے محروم ہی کر دی جاتی ہے جس سے گناہ کا امکان پیدا ہو یعنی ان میں عام انسانی طبیعتوں کی طرح گناہ کرنے کا مادہ ہی نہیں رکھا جاتا بلکہ وہ فرشتوں کی طرح گناہ کے ارتکاب کی قدرت ہی سے محروم ہیں لہٰذا ان میں اس کے ارتکاب کی نہ قدرت باقی رہتی ہے اور نہ اختیار حاصل ہوتا ہے اور کچھ لوگ ان میں کے اس بات کے قائل ہیں کہ معصوم گناہ کی فطری صلاحیتوں سے محروم تو نہیں کیا جاتا۔ اس کے اندر بھی انسانی طبیعتوں کے تقاضے موجود ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود نیکیوں پر اس کو زبردستی لگادیا جاتا ہے اور گناہوں سے بالجبر روک دیا گیا ہے۔ خود اپنے ارادہ اور اختیار سے وہ نہ تو نیکیوں پر قائم ہے اور نہ ہی گناہوں سے پرہیز کرتا ہے بلکہ وہ بے بس اور مجبور ہے کہ نیکی کرے اور گناہ سے دور رہے اس کے برخلاف شیخ ابو منصور ماتریدی و دیگر

اہلسنت والجماعت کا نقطۂ نظر عصمت کے سلسلے میں یہ ہے کہ عصمت ایک وہبی کمال اور محض عطیۂ ربانی تو ضرور ہے جو معصوم کو گناہوں سے باز رکھتا ہے مگر وہ نیکیوں پر اقدام کرنے یا گناہ سے پرہیز کرنے میں بے اختیار و مجبور نہیں ہے بلکہ وہ اپنے ہی اختیار اور قدرت سے بالارادہ نیکی کرتا ہے اور اسی طرح بالارادہ اپنے اختیار سے گناہوں سے گریز کرتا ہے۔ اس عصمت کی وجہ سے وہ نہ مجبور ہے نہ بے اختیار۔ ایسے ہی وہ عصمت کے حاصل ہونے کی وجہ سے عام انسانی طبیعتوں کے جذبات اور فطری تقاضوں یا گناہ کرنے کی صلاحیتوں سے محروم نہیں ہے بلکہ یہ سب کچھ اس کے اندر موجود ہیں لیکن اس کے باوجود وہ بہ اختیار خود گناہوں سے پرہیز کرتا ہے اور نیکیوں کی طرف ہر وقت متوجہ رہتا ہے اہلسنت کی دلیل یہ ہے کہ معصوم احکام شرعیہ کا پابند اور مکلف ہوتا ہے اس میں تو کسی کو اختلاف نہیں لہٰذا جب معصوم پر شرعی تکلیف کا نفاذ ہے تو اس کے بے اختیار اور مجبور ہونے کا کوئی معنیٰ ہی نہیں ہو سکتا احکام شرعیہ یا تکلیف شرعی کا مطلب یہی ہے کہ مکلف اپنے اختیار اور اپنی قدرت سے ہی عمل کریگا۔ اگر کوئی نیک عمل کرتا ہے تو اپنے ارادہ سے کرے اور اگر وہ کسی برے کام سے پرہیز کرتا ہے تو اپنے ارادہ اور قدرت سے پرہیز کرے ورنہ بے بس اور بے اختیار آدمی سے کسی ایسے کام کا مطالبہ کرنا جو اس کے بس سے باہر ہو اسی طرح بے سود ہوگا جیسے کسی اندھے

سے دیکھنے کا مطالبہ اور ایسے ہی جو چیز اس کے اختیار سے پہلے ہی باہر ہے اس سے روکنا بھی بے معنیٰ ہوگا کیونکہ وہ بے اختیاری کی وجہ سے پہلے ہی اس عمل سے رکا ہوا تھا مثلاً اندھے کو یہ کہنا بے معنیٰ ہوگا کہ تم مت دیکھو۔ ظاہر ہے کہ وہ دیکھنے کے عمل سے تو اس حکم سے پہلے ہی سے رکا ہوا ہے پھر یہ حکم تحصیل حاصل کے سوا کیا ہوگا۔ بنا بریں معصوم کا مکلف ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں اختیار وقدرت ہر گناہ کی ہوتی ہے۔ عصمت کا فائدہ صرف یہ ہے کہ وہ قدرت واختیار کے باوجود گناہ سے بالارادہ پرہیز کرتا ہے اور بالارادہ نیکیوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے ورنہ عصمت کا مطلب اگر سلبِ قدرت یا بے اختیاری اور مجبوری لے لیا جائیگا تو پھر تکلیف شرعی کا کوئی معنیٰ ہی نہ ہوگا۔ لہٰذا معصوم کو مکلف ماننا اس کے بااختیار اور صاحبِ قدرت ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ ملا علی قاری علیہ الرحمۃ نے گذشتہ عبارت میں اس کی تصریح فرمائی ہے اور مزید اس کی تشریح دوسری جگہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

لانہ لو کان الذنب ممتنعا	اس لیے کہ اگر گناہ معصوم کی قدرت سے
لما صح تکلیفہ بترک الذنب	باہر ہو تو اس کو گناہ سے باز رہنے کا
کالاعمیٰ لا ینہیٰ عن النظر	مکلف بنانا درست ہی نہ ہوگا جیسے کہ
المرتعش لا ینہیٰ عن السکون لانہ تحصیل	اندھے آدمی کو دیکھنے سے اور لرزندہ
الحاصل وتکلیف بما لیس بتحتہٗ	انسان کو سکون سے نہیں روکا جاسکتا کیونکہ

طائل ۔ اور رویت ان کے اختیار سے ہی باہر ہے نیز)

(شرح فقہ اکبر صفحہ ۱۸۰) یہ امر تحصیل حاصل ہے اور مکلف بنانا ایسی چیز کا

. . . . درست نہیں ہے جس میں کلفت کا تصور بھی ممکن نہ ہو

خلاصہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے حق میں عصمت کا عقیدہ قائم کیا گیا ہے ان کے متعلق یہ عقیدہ پہلے ہی سے اپنی جگہ متفق علیہ ہے کہ احکام شرعیہ کی پابندی ان کے لئے بھی ضروری ہے۔ خدا کی طرف سے جتنے اوامر ونواہی عام انسانوں کے لئے نافذ کیے گئے ہیں ان سب سے وہ کلی طور پر مستثنیٰ نہیں ہیں بلکہ تکلیف شرعی یا بلفظ دیگر احکام الٰہی منجانب اللہ ان پر بھی لاگو ہیں اور یہ بات مسلم ہے کہ شریعت کے امر ونہی کا تعلق انھیں چیزوں سے ہوتا ہے جو بندے کے اختیار وقدرت سے باہر ہوں۔ ورنہ جو امور سرے سے انسان کی قدرت سے ہی باہر ہوں ان پر بندش لگانا یا ان کا مطالبہ کرنا بالکل مہمل اور بے معنیٰ قسم کی بات ہے مثلاً ایک شخص اندھا ہے دیکھنا اس کے اختیار کی بات نہیں، اسی طرح نہ دیکھنے پر بھی وہ فطرتاً مجبور ہے اب اگر اس اندھے پر یہ بندش لگائی جائے کہ تم مت دیکھو تو یہ حکم ہی بے معنیٰ ہوگا اور بالکل لاحاصل بندش ہوگی۔ کیونکہ نہ دیکھنا تو اس کی فطری اور بے اختیاری چیز تھی جو اس بندش لگانے سے پہلے بھی اس کو حاصل تھی ایسا نہیں ہے کہ تعمیل حکم کے خیال سے اس اندھے نے اپنے

ارادہ سے اس کو پسند کیا ہو اور نافرمانی کے خطرے نے دہ دیکھنے سے باز رکھا ہو اس لئے جس شخص کو مکلف مانا گیا ہے اس کے حق میں عصمت کا مطلب اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ شخص جملہ گناہوں کے ارتکاب پر اختیار و قدرت رکھنے کے باوجود گناہ سے بالارادہ پرہیز کرتا ہے اگرچہ اس کی ذات میں تمام صلاحیتیں موجود ہیں وہ مجبور نہیں ہے مگر قدرت نے اس کی ذات میں ایک ایسی چیز بھی ودیعت کردی ہے جو گناہوں سے اس کو باز رکھتی ہے اسی مضمون کو امام غزالیؒ نے تفصیل کے ساتھ اس انداز میں بیان فرمایا ہے۔

امام غزالیؒ کی اصل عبارت اور احمد امین مصری کی غلط فہمی کا ازالہ

امام غزالی علیہ الرحمۃ احیاء العلوم جلد چہارم میں اس بات پر بحث کرتے ہوئے کہ توبہ ہر شخص کے لئے ضروری ہے اور ہر حالت میں واجب ہے فرماتے ہیں

وتوبوا الی اللہ جمیعا	اے ایمان والو سب خدا کی طرف توبہ کے
ایھا المومنون	ساتھ متوجہ ہو جاؤ ممکن ہے کہ کامیابی
لعلکم تفلحون ؕ	حاصل کرلو۔

بس خدانے اس جگہ خطاب عام فرمایا ہے اور نور بصیرت بھی اسی بات کی رہنمائی کرتا ہے کیونکہ توبہ کہتے ہیں اس راستے سے ہٹ جانے کو

جو خدا سے دور اور شیطان سے قریب کرتا ہے مگر یہ کام عقلمند سے ہی ہو سکتا ہے اور جوہر عقل کی تکمیل اسی صورت میں ہو گی کہ جب غضب و شہوت اور دوسرے رذائل جو انسان کے بہکانے میں شیطان کے لئے وسائل کا کام دیتے ہیں وہ سب کے سب مکمل طریقے پر موجود ہوں یہی وجہ ہے کہ کمالِ عقل چالیس سال کی عمر کے قریب حاصل ہوتا ہے البتہ اس کی بنیاد قرب بلوغ ہی پڑ جاتی ہے اور اس کے مبادیات ۷ سال کے بعد ہی ظاہر ہونے لگتے ہیں اور خواہشات نفس گویا کہ شیطانی فوج کا نام ہے اور عقول گویا کہ فرشتگانہ قوتوں کا نام ہے پس جب یہ دونوں جمع ہوں گے یقینا دونوں کے مابین جنگ چھڑ جائے گی اس لئے کہ ایک قوت دوسرے کو قدم جمانے کا موقع دینا ہرگز پسند نہ کرے گی کیونکہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں لہٰذا ان دونوں کے درمیان ایسا ہی اختلاف ہو گا جیسے رات اور دن، یا نور وظلمت کے درمیان اختلاف ہے اور جس وقت ان میں سے ایک کا غلبہ ہو جائے گا وہ لامحالہ دوسرے کو اکھاڑ پھینکے گا اور چونکہ خواہشات مکمل طور پر عقل کی تکمیل سے پہلے ہی بچپن اور جوانی ہی میں وجود پذیر ہو جاتی ہے اس لئے شیطانی فوج کا قبضہ اور تسلط قلب پر ہو جاتا ہے اور قلب کو بھی ان سے الفت ہو جاتی ہے لہٰذا شہوانی تقاضوں کا عادت بن جانا یقینی امر ہے اس لئے وہ قلب پر غالب رہتے ہیں اور ان سے دل کا علٰحدگی اختیار کرنا بڑا دشوار ہو جاتا ہے

پھر جب اس کے بعد آہستہ آہستہ عقل کا ظہور ہونے لگتا ہے جو کہ خدائی طاقت اور اس کی معاون ہے۔ نیز اس کے محبوبوں کو شیطانی دشمنوں کے ہاتھوں سے نجات دلانے والی ہے لہٰذا یہ عقل اگر قوی نہ ہو پائی اندر اس میں کمال پیدا نہ ہو سکا تو دل پر شیطان کا اقتدار باقی رہ جاتا ہے اور وہ ملعون اپنا وعدہ پورا کرلیتا ہے جو اس نے کہا ہے کہ

لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ۔ تھوڑے لوگوں کے سوا تمام ذریت آدم کو برباد کرکے رہوں گا۔

اور اگر عقل کامل اور مضبوط ہوتی ہے تو اس کا سب سے پہلا کام شہوات کو توڑ کر غلط عادتوں کو زائل کر کے اور بالجبر عبادات کی طرف موڑ کر شیطانی قوتوں کا خاتمہ کر ڈالنا ہے اور توبہ اسی کا نام ہے کیونکہ توبہ کہتے ہیں ایسے راستے سے مڑ کر خدا کی طرف متوجہ ہونے کو جس کی شہوت رہنما ہے اور شیطان معاون ہے پس کوئی آدمی وجود پذیر نہیں ہوا ہے مگر یہ کہ شہوت اس کے اندر عقل کی آمد سے پہلے ہی موجود ہوئی اور وہ پیدائشی خصائل جو شیطانی وسائل ہیں اس شخص کی فطری فرشتگانہ قوتوں سے مقدم ہوئی ہیں لہٰذا جو شہوانی تقاضوں کی موافقت کا مادہ آدمی میں پہلے سے موجود ہے اس سے رجوع یعنی (توبہ) کرنا ہر انسان کے لیے ضروری ہے چاہے وہ نبی ہو یا غبی۔ بنا بریں تمہیں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ توبہ و رجوع کی ضرورت صرف حضرت آدم علیہ السلام کے

لئے خاص ہے کہا گیا ہے شعر!

فلا تحسبن الهند لها الغدر وحدها
سجية نفس كل غانية هند

تم یہ نہ سمجھو کہ بدعہدی ہندہ کی کوئی مخصوص چیز ہے
بلکہ یہ تو ہر نفس کی عادت ہے لہٰذا ہر حسین
عورت کو ہندہ ہی کی طرح بدعہد تصور کرنا چاہیئے۔

بلکہ یہ تو یہ در رجوع امر ازلی ہے جو نوعِ بشر کے حق میں مقدر کر دیا گیا ہے اس کے بر خلاف تصور ہی نہیں کیا جا سکتا الّا یہ کہ سنت الٰہی میں ہی تبدیلی ہو جائے مگر اس کی توقع بھی نہیں ہے بنا بریں جو آدمی جہالت اور کفر میں بالغ ہوا ہے اس پر اپنی جہالت و کفر سے توبہ کرنا ضروری ہے۔ اور جو شخص اپنے والدین کے زیر سایہ بحالت ایمان اصل حقیقت ایمان سے بے خبر رہ کر بالغ ہوا ہے اس پر ایمان کی حقیقت سے بے خبری سے توبہ کرنا واجب ہے کیونکہ اس شخص کو والدین کے اسلام سے کوئی نفع نہ ہوگا تاوقتیکہ وہ خود اسلام قبول نہ کرلے اس لئے اگر وہ صاحب فہم ہے تو اس پر واجب ہے کہ اپنے سابق رذائل اور شہوات کے پیچھے بغیر کسی روک ٹوک کے پڑے رہنے سے رجوع کرے اپنے آپ کو قابو میں رکھنے اور بے قید کر دینے اور اپنے کو آزادی یا چھوٹ دینے میں احکام الٰہی کے سانچے میں ڈھل کر رجوع کرے۔ یہ کام توبہ کے ابواب میں سے بہت کٹھن باب ہے جس سے اکثر لوگ عاجز ہیں لہٰذا آیت بالا اس بات پر صریح دلالت کرتی ہے کہ توبہ ہر شخص کے لئے فرض عین ہے۔ کسی

فردِ بشر کے بارے میں یہ تصور صحیح نہیں ہے کہ وہ توبہ سے بے نیاز ہے جب آدم علیہ السلام ہی اس سے بے نیاز نہ رہ سکے تو اولاد کی فطرت میں اس چیز کی گنجائش کہاں سے آئے گی جس کی گنجائش سرے سے باپ ہی کی فطرت میں نہ رہی ہو۔ رہی توبہ کے ہر وقت واجب ہونے کی بات تو!

فهو ان كل بشر فلا يخلو عن معصية بجوارحه اذ لم يخل عنه الانبياء كما ورد في القرآن والاخبار من خطايا الانبياء وتوبتهم وبكائهم.

اس میں شبہ نہیں کہ کوئی فردِ بشر جسمانی اعضا کی ہر معصیت سے خالی نہیں ہے، کیونکہ جب اس سے انبیاء علیہم السلام ہی خالی نہیں رہے تو دوسروں کا سوال ہی کیا ہے، جیسا کہ قرآن پاک اور احادیث میں ان کا اپنی خطاؤں سے توبہ کرنے اور رونے گڑگڑانے کا ذکر موجود ہے

پھر اگر کوئی شخص کسی وقت جسمانی اعضا کے گناہ سے بچ بھی جائے تو گناہوں کے تصور سے تو خالی نہیں ہوگا اور اس سے بھی کسی وقت خالی مان لیا جائے تو خدا کے ذکر سے غافل کر دینے والے متفرق خطرات جو شیطانی وسوسہ کی وجہ سے ہوتے ہیں ان سے خالی نہ ہوگا اگر ان سے بھی خالی مان لیا جائے تو کم از کم خدا کی ذات و صفات اور اس کے افعال کے سلسلہ میں بے علمی یا نقصانِ علمی سے تو خالی نہ ہوگا اور یہ تمام چیزیں

بہرحال ایک قسم کا نقص ہی ہے جن کیلئے کچھ اسباب و وجوہ ہیں لہٰذا ان کے اسباب کو اس طرح چھوڑ دینا کہ منافی جو چیز ہے اس میں مشغول ہو جائے یہ بھی ایک راستہ سے اس کی ضد کی طرف رجوع کرنا ہوا پس کسی آدمی کے بارے میں اس نقص سے بری ہونے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں اس نقص کی مقداروں میں فرق دافراد بنی آدم کے درمیان ضرور ہے لیکن جہاں تک اصل نقص کا معاملہ ہے وہ تو بہرحال موجود ہے۔ اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میرے قلب پر بھی ابر غفلت چھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ میں دن رات میں ستر مرتبہ خدا سے استغفار کرتا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر سے خطاب فرما کر اعزاز بخشا ہے۔

واذا کان حالہ فکیف حال غیرہ (احیاء العلوم صفحہ ۱۰۹ ج ۴)

پس جب یہ حال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے تو دوسروں کا کیا ہوگا (خود غور کرلو)

امام غزالیؒ کے اس طویل بیان کا یہی حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نوعِ بشر کی فطرت میں خیر و شر کا امتزاج رکھا ہے اس لئے شر کی طرف اس کا میلان فطری تقاضہ کے تحت ہے لیکن جن کی عقل جس درجہ کامل ہوتی ہے اور جن کے صفات فرشتگانہ جس قدر قوی ہوتے ہیں وہ اسی درجہ شیطانی خواہشات اور شر کے تقاضوں سے دور ہوتے جاتے

ہیں۔ یہ قاعدہ تمام بنی آدم کے لئے عام ہے اور سارے افراد بشر کا
اس قاعدے سے تعلق برابر درجے کا ہے کوئی فرد بشر حتیٰ کہ انبیاء کرام
بھی اس نقص سے خالی نہیں ہیں البتہ ان کے حسب مراتب اس نقص کی
مقدار میں فرق ضرور ہوگا۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ کوئی فرد اس نقص سے خالی
ہو۔ مذکورہ عبارت میں کوئی جملہ ایسا نہیں ہے جس سے عصمتِ انبیاء
کے مسئلے پر کوئی زد پڑتی ہو۔ باقی امام غزالیؒ نے انبیاء کرامؑ سے خطاؤں
کے صدور پر توبہ کرنے وغیرہ کے بارے میں جو قرآن و حدیث کا حوالہ
دیا ہے وہ اگرچہ اپنی جگہ درست ہے۔ لیکن اس کے اندر بھی امام غزالیؒ
نے کسی ارادی گناہ کی نسبت انبیاء کرامؑ کی طرف نہیں کی ہے بلکہ بلا ارادہ
ہونے والے گناہ یعنی لغزش اور خطا کی نسبت انھوں نے انبیاءؑ کی طرف
کی ہے جس سے خواہ مخواہ احمد امین مصری صاحب نے انبیاءؑ کی بے عصمتی
کا نظریہ کشید کر لیا ہے۔ آئندہ صفحات میں اس انداز کی بحثیں آرہی ہیں۔
جن سے، امام غزالیؒ کی اس عبارت کا مفہوم زیادہ واضح ہو جائے گا
لیکن اتنی بات تو اس جگہ پر بھی سمجھی جاسکتی ہے کہ امام غزالیؒ نے عصمت کا
انکار نہیں کیا ہے بلکہ ہر انسان میں خواہشات اور ان کے تقاضوں کے
موجود ہونے کا دعویٰ کیا ہے جو اپنی جگہ حق ہے کیونکہ پہلے بھی یہ بات
واضح طریقے پر گذر چکی ہے کہ عصمت کا مفہوم اہلسنت والجماعت کے

نزدیک گناہ کی صلاحیتوں سے محرومی یا سلب امکان اور بے اختیاری نہیں ہے اس لئے امام غزالیؒ کی عبارت میں عصمتِ انبیاءؑ کے خلاف کوئی چیز نہیں ہے یہ اور بات ہے کہ احمد امین مصری نے اپنی کج فہمی اور ایک خاص ذہنیت کی وجہ سے اس عبارت کو اپنے لئے سند بنالیا ہے حالانکہ یہ کسی طرح درست نہیں ہے البتہ معتزلہ اور شیعہ کے نزدیک عصمت سلب امکان کے ہم معنیٰ ہے۔

عصمت کی حقیقت میں اختلاف کا نتیجہ

اہلسنت اور شیعہ اور معتزلہ کے مابین عصمت کی حقیقت میں اس بنیادی اختلاف کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اہلسنت کے نزدیک معصوم کی ذات میں چونکہ قدرت و امکان موجود ہے اس لئے اس سے ہر قسم کے گناہ کا وقوع عقلاً جائز ہوگا اگرچہ عصمت کے سبب یہ چیز وجود پذیر نہیں ہوسکتی۔ اس کے برخلاف شیعہ اور معتزلہ کے نزدیک چونکہ معصوم گناہ کی قدرت سے محروم ہے اور اس کے اندر کسی گناہ کی صلاحیت ہی سرے سے موجود نہیں اس لئے کسی معصیت کا امکان بھی عقلاً اس سے نہیں ہوسکتا جیسا کہ اس بات کا امکان شرعاً بھی نہیں ہے۔ اختلاف کے اس ثمرہ کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھا جاسکتا ہے وہ یہ کہ اندھے آدمی میں جس طرح قوت بینائی موجود نہیں اس لئے کسی غلط چیز کو دیکھنا اسکے لئے نہ عادۃً ممکن ہے نہ شرعاً و عقلاً

ہی اس کی گنجائش ہے اس کے برخلاف جس شخص کے اندر قوت بینائی اچھی طرح موجود ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے ارادہ و اختیار سے کسی غلط چیز پر نگاہ نہیں ڈالتا اگرچہ اس کے لئے یہ امر ممکن ہے کہ جب چاہے نگاہ ڈالے لیکن خداوند تعالیٰ کے فضل و کرم نے اس شخص کی حفاظت کر رکھی ہے کہ اس کی طبیعت کو ہر غلط چیز سے متنفر کر دیا ہے جس کے سبب وہ کسی غلط چیز کی طرف نگاہ نہیں اٹھاتا اہلسنت کے نزدیک معصوم کی مثال دوسرے شخص کی سی ہے اور معتزلہ کے نزدیک معصوم پہلے شخص یعنی اس اندھے کی طرح ہے گناہوں کے عقلی جواز اور شرعی عدم جواز کا مطلب بھی یہی ہے۔ چنانچہ علامہ عبدالعلی بحر العلوم اور علامہ محب اللہ بہاری مسلم الثبوت اور اس کی شرح فواتح الرحموت میں لکھتے ہیں۔

اختلفوا فی عصمۃ الانبیاء قبل النبوۃ	لوگوں میں نبوت کے پہلے انبیاء کرام علیہم السلام کی عصمت کے مسئلہ کے اندر اختلاف ہے۔
فالاکثر من المسلمین علی انہ لا یمتنع عقلاً ذنب منہم مطلقاً ای ذنب کان صغیرۃ او کبیرۃ او کفرا وقوعہ خلافا للشیعہ	لیکن زیادہ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ عقلاً ان سے کوئی گناہ بھی ناجائز نہیں ہے صغیرہ ہو یا کبیرہ یا کفر ہی کیوں نہ ہو بخلاف شیعہ کے اس لئے کہ وہ لوگ انبیاء کرام پر مطلقاً کسی گناہ کو بھی عقلاً جائز

فانهم لا یجوزون عقلاً ذنب علیہم مطلقًا وخلافًا للمعتزلۃ الا فی الصغیرۃ فانہم یجوزونہا (فواتح الرحموت بہ تغییر واختصار صفحہ ۳۰)

نہیں مانتے اور بخلاف معتزلہ کے کیونکہ وہ بھی صغیرہ کے علاوہ کسی گناہ کو انبیاء کے لئے عقلاً جائز نہیں قرار دیتے ہیں۔

اس عبارت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اکثر مسلمان کے نزدیک قبل نبوت معاذ اللہ نبی ہر قسم کے گناہ میں ملوث ہو سکتا ہے کیونکہ از روئے شرع یہ بات کسی طرح سے جائز نہیں ہے بلکہ اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ عقلاً اس کے اندر گناہ کی قدرت و صلاحیت موجود ہونے کے سبب گناہ بھی ممکن ہے اگرچہ شرعًا کبھی بھی اس کا وقوع نہیں ہوگا اس کے برخلاف شیعوں کے نزدیک نبی کے اندر گناہ کی قدرت ہی موجود نہیں لہٰذا جس طرح شرعًا وقوع ناجائز ہے اسی طرح عقلاً بھی ناجائز ہوگا معتزلہ کا بھی یہی خیال ہے۔

قاضی ابوبکر کی طرف یہ انتساب غلط ہے

البتہ اہلسنت میں سے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شرعًا بھی قبل نبوت ہر معصیت جائز ہے اگرچہ کفر ہی کیوں نہ ہو مگر بعد نبوت شرعًا جائز نہیں چنانچہ علامہ آلوسی روح المعانی میں تحریر فرماتے ہیں۔

نعم لا اشکال فیہ علیٰ ماقالہ قاضی ابوبکر من انہ

ہاں قاضی ابوبکر کے مذہب کے مطابق اس میں کوئی اشکال نہ ہوگا کیونکہ وہ کہتے

لا یمتنع عقلاً ولا سمعاً ان یصدر من النبی علیہ السلام قبل نبوتہ معصیۃ مطلقاً بل لا یمتنع عقلاً ارسال من اسلم بعد کفرہ (روح المعانی صفحہ ۲۷۳ / ۱۹۲)

ہیں عقلاً اور شرعاً یہ بات ممکن ہے کہ نبی سے قبل نبوت ہر طرح کی معصیت کا وقوع ہو جائے بلکہ یہ بھی محال نہیں کہ خدا ایسے شخص کو رسول بنا دے جو کفر کر چکا ہے لیکن اسلام لے آیا۔

اہلسنت میں کسی کی طرف بالخصوص قاضی ابوبکر کی طرف اس مسئلہ کو منسوب کرنا ہمارے نزدیک کسی طرح درست نہیں ہے۔ اولاً اس لئے کہ قاضی ابوبکر کے کہنے کا مقصود یہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک دوسری بات سمجھانا چاہتے ہیں مگر لوگوں نے شرعاً بھی قبل نبوت گناہ کا جواز حتیٰ کہ کفر کا جواز سمجھ لیا اور اسی کو ان کا مسلک سمجھ کر ان کی طرف منسوب کر گئے خود علامہ آلوسی نے بھی اس رائے کو قبول نہیں کیا ہے اس لئے وہ قبل نبوت اور بعد نبوت نبی کے معصوم ہونے کی بار بار تصریح فرماتے ہیں جیسا کہ ان کی عبارت آگے آرہی ہے دیکھئے نبر اس صفحہ ۵۲، صفحہ ۵۳ ثانیاً یہ مسئلہ آئندہ اوراق میں بے شمار حوالوں سے ثابت کیا جائے گا کہ شرعاً نبوت سے پہلے خوارج کے فرقہ ازارقہ اور شیعہ کے فرقہ فضلیہ کے علاوہ تمام امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کسی نبی سے قبل نبوت کفر جائز نہیں ہے اگر اہل سنت میں سے کسی معتبر بزرگ اور مستند عالم کو اس سے اختلاف ہوتا بالخصوص قاضی

ابوبکر کو بھی اس سے اختلاف ہوتا تو جس طرح ازارقہ اور فضلیہ کا اختلاف لوگوں نے نقل کیا ہے اس مقام پر قاضی ابوبکر کا اختلاف ضرور نقل کیا گیا ہوتا لیکن کسی ایک مستند عالم نے بھی نقل نہیں کیا ہے جس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ آلوسی علیہ الرحمۃ کو قاضی ابوبکر کی رائے کے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے ورنہ قاضی ابوبکر بھی جملہ اہلسنت کی طرح قبل نبوت نبی کے لئے معصیت کو صرف عقلاً جائز کہتے ہیں نہ کہ شرعاً جیسا کہ فواتح الرحموت کے حوالہ سے گذر چکا ہے۔

ثالثاً اگر یہ نسبت قاضی ابوبکر کی طرف درست بھی تسلیم کر لی جائے تو باتفاق اہلسنت یہ رائے قابل قبول نہ ہوگی جیسا کہ آئندہ صفحات سے معلوم ہو جائے گا۔

ان مباحث کے سامنے آجانے کے بعد ناظرین یہ سمجھ گئے ہوں گے کہ مولانا مودودی نے رسائل و مسائل کے اندر جو یہ بات تحریر کی ہے کہ نبی کی عصمت فرشتوں جیسی نہیں ہے اور عصمت سلب امکان کا نام نہیں ہے کہ گناہ پر قدرت ہی نہ رہے بلکہ عصمت کے باوجود گناہوں کا ارتکاب اس کے مقدور میں ہوتا ہے یہ بالکل صحیح اور درست ہے بلکہ یہ وہی مسئلہ ہے جس کی وضاحت اب تک پیش کی گئی ہے۔ مولانا مودودی کے اس نظریہ پر کسی کو اعتراض نہیں ہے ان کا جو نظریہ قابلِ اعتراض ہے

وہ یہ ہے ۔

کیا عصمت لازم ذات ہے

مولانا مودودی کے نزدیک نہ تو عصمت لازم ذات ہے اور نہ ہی نبوت سے پہلے عصمت کسی نبی کو حاصل ہوتی ہے ۔ چنانچہ مودودی صاحب کی یہ عبارتیں کسی تشریح و وضاحت کی محتاج نہیں ہیں ۔

۱۔ عصمت دراصل انبیاء علیہم السلام کے لوازم ذات سے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب نبوت و رسالت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے مصلحتاً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمایا ہے (تفہیمات ص ۴۳ ج ۲)

۲۔ اور قبل نبوت کسی نبی کو وہ عصمت حاصل نہیں ہوتی جو نبی ہونے کے بعد ہوا کرتی ہے (رسائل و مسائل ص ۲۵ اول)

۳۔ نبی ہونے کے پہلے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی ایک بہت بڑا گناہ ہو گیا تھا کہ انھوں نے ایک انسان کو قتل کر دیا چنانچہ جب فرعون نے ان کو اس فعل پر ملامت کی تو انھوں نے بھرے دربار میں اس بات کا اقرار کیا کہ فعلتها اذاً و انا من الضالین (رسائل و مسائل اول ص ۲۵)

بالترتیب ہم مودودی صاحب کے دونوں نظریئے کا تحقیقی جائزہ ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں ۔

لازم ذات کی تحقیق

درحقیقت عصمت کے لازم ذات

نہ ہونے کا نظریہ اس امر پر مبنی ہے کہ مقام نبوت و رسالت پر سرفراز ہونے سے پہلے نبی عام انسانوں کی طرح ہوتا ہے یعنی عام انسانی طبیعتوں اور ذاتِ نبوت کی طبیعت و مزاج میں کوئی فرق نہیں ہوتا حالانکہ سرے سے یہ خیال ہی صحیح نہیں ہے کیونکہ قبل نبوت بھی نبی کی ذات عام انسانی طبیعتوں سے مختلف ہوتی ہے اور خیر و صلاح اور عقیدہ و عمل کی پاکیزگی قبل نبوت سے ہی بلکہ پیدائشی طور سے ذاتِ نبوت میں ودیعت کی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ عام انسانوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔

نکتہ نخستیں آنکہ نفوس قدسیہ انبیاء علیہم السلام در غایت صفا و علو فطرت آفریدہ شدہ است و در حکمتِ الٰہی ہماں صفا و علو فطرت مستوجب وحی گشتہ اند و ریاست عالم مفوض شدہ قال اللہ تعالیٰ اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہٗ

(ازالۃ الخفاء ۹/۱۲)

. . . .

اولین نکتہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے پاک نفوس بے انتہا پاکیزہ اور عالی فطرت پیدا کئے جاتے ہیں۔ اور خداوند قدوس کے انتخاب حکیمانہ میں وہ اسی پاکیزگی اور عالی فطرت ہونے کی وجہ سے وحی رسالت و نبوت کے مستحق ہو جاتے ہیں اور سارے عالم کی اصلاح کا معاملہ ان کے سپرد ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ خدا خوب اچھی طرح جانتا ہے اس جگہ کو جہاں وہ رسالت کو رکھنے والا ہے

ایک دوسرے موقع پر شاہ صاحب نے مزید تشریح و وضاحت بھی فرمائی ہے لکھتے ہیں۔

و از لوازم[1] نبوت و بمنزلۂ اجزاء و تمیز
این شخص است کہ پیغامبری او خواستہ اند از
سائر افراد بشر در ہر دو قوت نفس
ناطقہ اعنی قوت عاقلہ و قوت عاملہ
و الیہ الاشارۃ فی قولہ
تعالیٰ اللہ اعلم حیث یجعل
رسالتہ . . . . . .
. . . . . و ہمچنیں
در قوت عاملہ او مددے می دہد کہ
بسبب آں سمت صالح نصیب او
شود و اجتناب معاصی و رعایت
آداب طاعات و تدبیر منازل و

جس شخص کی رسالت چاہی گئی ہے اس کی
ذات نبوت کے لوازم اور اجزائے امتیازیہ
میں سے یہ بات ہے کہ وہ تمام افراد بشر
سے دونوں صلاحیتوں میں ممتاز ہو یعنی عقلی
صلاحیت اور عملی صلاحیت اسی طرف اللہ
تعالیٰ اپنے قول اللہ اعلم حیث یجعل
رسالتہ میں اشارہ فرما رہے ہیں۔
. . . . . (جیسا کہ عقلی استعداد کے
متعلق گزرا) اسی طرح اس نبی ہونے والے
شخص کی قوت عمل کو از غیب مدد پہونچائی
جاتی ہے جس کی وجہ سے نیک رجحان اس
کا مقدر بن جاتا ہے اور گناہوں سے

[1] لوازم نبوت کا ترجمہ لازم ذات اس لئے کیا گیا کہ گفتگو قبل نبوت کی زندگی سے متعلق ہے جس وقت کہ ذات نبوت وصف نبوت سے خالی ہے چنانچہ خود شاہ صاحب کی تصریح بھی آگے آرہی ہے کہ عصمت صفت ذات ہے نہ صفت نبوت۔

وسیاست مدنیہ بوجہے کہ ازاں خوب
ترصورت نہ بندد بروزے کار آید
وخلق شجاعت وسخاوت وکفایت
وعدالت وشناختن مصلحت ہر وقتی از
استقامت قوت عاملہ حاصل می شود
وکمال ایں قوت مفضی می گردد بر عصمت
وبسوئے ایں اشارہ واقع شدہ است
در حدیث السمت الصالح جزء من
خمسۃ وعشرین جزءً من اجزاء
النبوۃ وچوں ہر دو قوت علی الوجہ
الذی ینبغی مہذب شوند
از جانب غیب برائے ہر یکی مددے
فرود آید در مجاری امور شخص
برکات بسیار بظہور می آید کہ
کہ احصاء آں متعذر است۔
(ازالۃ الخفا)

گریز کرنا یا نیکیوں کے آداب ملحوظ رکھنا
یا گھریلو زندگی اور ملکی معاملات کا برتنا اس شخص
سے اس طرح ظہور پذیر ہوتا ہے کہ جس سے
بہتر ممکن نہیں اور دلیری، سخاوت، قوت فیصلہ
بے فسقی اور مصلحت شناسی یہ تمام عادات (اس کی)
قوت عمل کی استقامت سے ہی حاصل ہوتی ہیں
ان قوتوں کا ترقی پذیر ہونا ان کو عصمت کا
مستحق بنا دیتا ہے اسی قوت عمل کی طرف اس
حدیث میں اشارہ ہے کہ نیک روی نبوت کے
۲۵ اجزا میں سے ایک جز ہے اور چونکہ یہ
دونوں قوتیں (قوت عاقلہ، قوت عاملہ) جیسا
چاہئے ویسا مہذب ہو جاتی ہیں اور غیبی طریقے
پر ان میں سے ہر قوت کو تقویت بخشی جاتی ہے
اس لئے اس ذات کے اعمال واحوال میں بے شمار
برکتوں کا ظہور ہوتا رہتا ہے جن کا احاطہ
کرنا دشوار ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی یہ تحقیقات اس بات میں صریح ہیں کہ

کہ ذاتِ نبوت کے لئے عصمت یعنی گناہوں سے گریز کرنا ایک امر لازم ہے جو نبوت کے پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے بلکہ غور کرنے سے یہ بات اور واضح ہوتی ہے کیونکہ عصمت کے حاصل ہونے یا پائے جانے کے بہر حال کچھ اسباب و وجوہ ہوں گے اگر وہ اسباب و وجوہ قبل نبوت موجود ہوں تو پھر عصمت کے قبل نبوت موجود نہ ہونے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی۔ پس اس صورت میں عصمت لامحالہ لازمۂ ذات ٹھہرے گی۔

چنانچہ اس سلسلہ میں خود شاہ صاحب ہی تحریر فرماتے ہیں۔

والعصمۃ لہا اسباب ثلثۃ	عصمت کے تین اسباب ہیں (اول) یہ کہ
ان یخلق الانسان نفیا عن	انسان کی تخلیق ہی شہوانی رذائل سے منزہ
الشہوات الرذیلۃ سمحًا	مبرا بالکل سادہ لوحی پر ہو بالخصوص ان
لاستیمانیما یرجع الی محافظۃ	امور میں جن کا حدود شرع کی محافظت
الحدود الشرعیۃ و	و نگرانی سے تعلق ہے (دوم) یہ کہ اس کے
ان یوحی الیہ حُسْنُ الحَسَنِ	پاس اچھے کام کی بھلائی اور برے کام
وقُبح القبیح ومالہما	کی برائی ان دونوں کے انجام کے متعلق وحی آیا کرے
وان یحول اللّٰہُ بینہ	(سوم) یہ کہ خود اللہ تعالیٰ اس کے اور
بین مایرید من الشہوات	شہوانی رذائل کے قصد کے درمیان
الرذیلۃ (حجۃ اللہ البالغۃ مطبوعہ شہید مصفحہ ۸۶)	حائل ہو جائے۔

ایک مقام پر شاہ صاحب نے اس سے بھی زیادہ مسئلہ کی تشریح و توضیح فرمائی ہے لکھتے ہیں۔

اعلم ان العصمة لها اسباب ثلثة احدها ان یخلقهم فی سلامة الفطرة وکمال اعتدال الاخلاق فلا یرغبون فی المعاصی بل یکونون متنفرین عنها وثانیها ان یوحی الیهم ان المعاصی یعاقب علیها والطاعات یثاب علیها فیکون ذالک ردا عن المعاصی والثالث ان یحول الله تعالیٰ بینه وبین المعاصی باحداث لطیفة فیه کظهور صورة یعقوبؑ علی اصبعه فی قصة یوسفؑ قاله ولی الله الدهلوی (حاشیہ نبراس ص ۵۲)

ذہن نشین کرلو کہ عصمت کے اسباب ووجوہ تین ہیں، ایک یہ ہے کہ ان معصوموں کو اللہ تعالیٰ نیک طبیعت اور اعلیٰ درجہ کے معتدل اخلاق پر تخلیق فرماتا ہے اسی لئے گناہوں سے گریز کرتے ہیں بلکہ اس سے متنفر رہتے ہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ ان کے پاس صحیح وحی آتی ہے کہ معاصی پر سزا دی جائے گی اور اعمالِ خیر پر ثواب ملے گا پس یہ چیز بھی معاصی کے ارتکاب سے روک بن جاتی ہے تیسرا سبب یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ ان کے اور معاصی کے درمیان ایک پاکیزہ لطیفہ پیدا کر کے حائل ہو جاتا ہے جیسے حضرت یعقوبؑ کی تصویر ظاہر ہوئی تھی حضرت یوسفؑ کے واقعہ میں ان کی انگلی پر۔

عصمت کے ان اسباب و وجوہ پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہے کہ ان میں دو سبب نزول وحی اور زمانۂ نبوت کے پہلے بھی موجود ہوتے ہیں یعنی پہلا سبب اور تیسرا سبب۔ لہٰذا ان دونوں اسباب و وجوہ کا ہونا اس بات کی مضبوط دلیل ہے کہ عصمت بھی قبل نبوت موجود ہوتی ہے یہ اور بات ہے کہ عصمت قبل نبوت اس درجہ قوی نہیں ہوتی جس درجہ کی زمانۂ نبوت میں ہوتی ہے لیکن نفس وجود کا انکار کسی طرح درست نہیں ہے۔

قبل نبوت بھی انبیاء کرام کی زندگی ممتاز ہوتی ہے

انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے زمانۂ نبوت سے پہلے کی زندگی کو عام انسانوں کی زندگی جیسا تصور کرنا غلط خیال ہے جس کے ابطال و تردید کی طرف شاہ ولی اللہ صاحب نے بار بار توجہ فرمایا ہے اور قبل نبوت کی امتیازی زندگی یعنی علم و عمل میں عام انسانی زندگیوں کے مقابلہ میں قبل نبوت دونوں پہلوؤں سے انبیاء کرام کی زندگی فائق و بلند ہوتی ہے اس عقیدے کو شاہ ولی اللہ صاحب نے پوری قوت کے ساتھ اپنے خاص حکیمانہ انداز میں مختلف طریقے سے ثابت کیا ہے چنانچہ عصمت قبل نبوت کے سلسلے میں ان کا یہ حقیقت افروز بیان قابل دید ہے۔ فرماتے ہیں۔

پس نبوت امرے است حادث بسبب	پس نبوت ایک ایسی چیز ہے جو اصلاحِ عالم
تعلق ارادہ بہ بعث ایں پیغامبر بجہت	کے لئے اس پیغمبر کی بعثت سے ارادۂ الٰہی

اصلاح عالم نه امر جبلی و نه مکتسب
بریاضت آدمی این دولت نمی دهد.
مگر کسے را که نفسِ نفس او قدسیه
باشد در اصل جبلت مجرد از
ملاء اعلیٰ و قوی ملکیه که در وے
مندمج است در غایت ظهور و غلبه
و صفا و فلاح و سعادت و مزاج
بدن او در نهایت اعتدال
انسانی طبیعت قویه دارد. فی الغایة
اما منقاد قلب و قلب او در شدت
متانت و شهامت و اما منقاد
عقل و عقل او در کمالِ جودت
و استقامت. اما منقاد ملاء اعلیٰ
و نسخه از ایشان و آئینه برای
ایشان قوت عاقله او شبیه بادراک
ملاء اعلیٰ است و لهذا قبول
وحی می فرماید و قوت عامله

کے متعلق ہونے کے سبب پیدا ہوتی ہے
نہ پیدائشی چیز ہے نہ ریاضت و مجاہدہ کے ذریعہ
کسبی البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ یہ دولت صرف
اس کو دی جاتی ہے جس کا نفس قدسی
الصفات ہو اور ابتدائے فطرت سے ملاءِ اعلیٰ
میں اس کا شمار ہو اور جو ملاءِ اعلیٰ کی صلاحیتیں
اس ذات میں شامل ہیں وہ بے حد ظاہر غالب
پاکیزہ، کامیاب اور سعید ہوتی ہیں اور اس کا
مزاج غایت درجہ اعتدال کی حالت پر بہت
مستحکم ہوتا ہے یا تو قلب کے مطیع ہونے کے
سبب اور اس کا قلب بہت زیادہ متین اور
جری ہوتا ہے اور یا عقل کے مطیع ہونے کے
سبب اور اس کی عقل پختگی اور کمالِ جودت
پر ہوتی ہے اور یا پھر ملاءِ اعلیٰ کا مطیع ہونے
کے سبب اور ان کا ایک نمونہ اور آئینہ ہونے
کی وجہ سے نیز اس کی قوت عاقلہ ملاءِ اعلیٰ کے
ادراک کے مشابہ ہوتی ہے اس لئے وہ شخص

او در غایت صلاح

ولہذا عصمت صفت او می باشد
واین امور لازم اعظم نبوت
است. سنۃ اللہ بآں جاری
شدہ کہ نبوت عنایت نہ فرمایند
مگر کسے را کہ چنیں آفریدہ شدہ
باشند و بسا مردم اصحاب نفوس
قدسیہ کہ ببعض ایں اوصاف
یا باکثر آں متصف باشند
نبوت نصیب ایشاں نہ باشد
چنانچہ مثل مشہور است کہ

شعر

گور خر نہ گرفت مگر آں کہ دوید
نہ ہر آنکہ دوید گور گرفت

. . . .

. . . .

ولا کل من یسعیٰ یصید غزالۃ

وحی قبول کرلیتا ہے اور اس کی قوت عمل
بھی بے انتہا درست ہوتی ہے اسی لئے
عصمت اس شخص کی صفت ہو جاتی ہے
یہ چیزیں نبوت کے عظیم لوازم میں سے
ہیں عادۃ اللہ اسی طرح جاری ہے کہ
نبوت صرف ایسے ہی شخص کو عطا کی جاتی
ہے جو ان اوصاف کے ساتھ پیدا کیا
گیا ہو اور کتنے قدسی صفات انسان
ہیں جن کے اندر ان اوصاف میں سے بعض
یا اکثر موجود ہیں لیکن نبوت میں ان کا
حصہ نہیں ہو سکا جیسا کہ مشہور مثل ہے

شعر: گورخر نگرفت مگر آں کہ دوید
نہ ہر آنکہ دوید گور خر گرفت

(ہر کوشش کرنے والا ہرن شکار نہیں کرلیتا
ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ جس نے ہرن
شکار کرلیا ہے اس نے کوشش ضرور کی ہے)

شعر: ہر کوشش کرنے والا ہرن شکار نہیں کرلیتا ہے

ولکن من صاد العزالة فلیسعی — لیکن یہ بات ہے کہ جس نے ہرن شکار کر لیا ہے اس نے کوشش بھی ضرور کی ہے

. . . .

قال اللہ تعالیٰ اللہ — اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

اعلم حیث یجعل رسالتہ — خدا اس کو خوب جانتا ہے جس کے رسول بنانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

(ازالۃ الخفاء جلد ۱ صفحہ ۵۲)

اس طویل اقتباس میں خط کشیدہ عبارت اس بات کی صریح دلیل ہے کہ عصمت لازم ذات ہوتی ہے نہ کہ لازم نبوت۔ کیونکہ عصمت اگر وصف نبوت کا لازمہ ہوتی تو شاہ صاحب "لہٰذا عصمت صفت نبوت می باشد" تحریر فرماتے "و صفت اومی باشد" ہرگز نہ لکھتے۔

بہرحال قبل نبوت کے سلسلہ میں شاہ ولی اللہ صاحب کی منقولہ بالا عبارتوں میں اس تشریح کے علاوہ دو آیتوں کی طرف اشارہ بھی پایا جاتا ہے جو در اصل عصمت قبل نبوت کی دلیل ہیں۔ پہلی آیت یہ ہے

اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ — اللہ خوب جانتا ہے اس جگہ کو جہاں وہ رسالت رکھنے والا ہے۔

آیت اپنے مفہوم میں بالکل صریح ہے کہ جس شخص کا انتخاب رسالت و نبوت کے لئے خداوند تعالیٰ فرماتے ہیں اس کے اندر ایسے صفات و کمالات ضرور ہوتے ہیں جس کی بنا پر وہ شخص اس منصب جلیل کا اہل قرار پاتا ہے

چنانچہ امام رازیؒ فرماتے ہیں ۔

فالمعنیٰ ان للرسالۃ موضعاً مخصوصاً موصوفاً بتلک الصفات التی لاجلہا یصلح وضع الرسالۃ فیہ کان رسولاً دالا فلا ۔

(تفسیر کبیر ج ۱۳ ص ۱۴۲)

مطلب یہ ہے کہ رسالت و نبوت کے لئے ایک مخصوص جگہ ہے کہ اس کے سوا کسی اور جگہ اس کا رکھنا درست ہی نہیں لہٰذا جو ذات مخصوص اور اُن صفات سے موصوف ہوگی کہ جن کے سبب سے وہ مقام رسالت کے اہل قرار پائے ۔ وہی رسول بنائی جائے گی ورنہ نہیں ۔

امام رازیؒ کی اس عبارت کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ جس ذات کو آئندہ چلکر رسالت و نبوت کے مقام پر فائز ہونا ہے وہ قبل نبوت سے ہی فطری طور پر دوسرے تمام نفوس کے مقابلہ میں نہایت پاکیزہ، عالی کردار، نیک سیرت اور صالح ہوتی ہے یعنی وہ جوہر قابل اپنے حسنِ عمل اور ذاتی استعداد کی وجہ سے رسالت و نبوت کا مستحق ہوتا ہے اسی لئے نگاہ انتخاب بھی اسی پر پڑتی ہے ۔ ایسا نہیں کہ دوسرے انسانوں کے درمیان اور اس کے درمیان کسی طرح کا کوئی فرق نہ ہو اس کے باوجود خداوند تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے عطائے خاص کے ذریعہ نبی یا رسول بنا دیا ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ شخص اپنے اندر ایسے اوصافِ

کمالات رکھتا ہے جو اس کو نبوت و رسالت کا مستحق بنا دیتے ہیں اور اسی اہلیت کی وجہ سے پروردگار عالم اس کو اپنے فضل و کرم سے نوازتے ہیں اور منصب نبوت پر فائز کرتے ہیں ان کے یہ اوصاف اگرچہ نبوت و رسالت دینے پر خداوند تعالیٰ کو مجبور نہیں کر دیتے تاہم اس کے حصول کا مستحق ضرور بنا دیتے ہیں لیکن خداوند تعالیٰ کو اس فیصلہ پر مجبور اس لئے نہیں کرتے بلکہ جو ہر قابل ہونے کے باوجود اگر خدا چاہے تو اس کو شرف نبوت عطا نہ کرے اگرچہ اس کا مستحق ہی کیوں نہ ہو۔ علامہ آلوسی علیہ الرحمۃ اسی آیت کے تحت فرماتے ہیں۔

والمعنیٰ ان منصب الرسالۃ
لیس مما ینال بما یزعمونہ
من کثرۃ المال والولد و
تعاضد الاسباب والعدد
وانما ینال بفضائل نفسانیۃ
ونفس قدسیۃ افاضہا اللّٰہ
تعالیٰ بمحض الکرم والجود
علیٰ من کمل استعدادہ و
نص بعضھم علیٰ انہ تابع

معنیٰ یہ ہے کہ منصب رسالت مال و اولاد کی
کثرت یا ساز و سامان کی فراوانی کے ذریعہ
نہیں ملتا ہے جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ
وہ منصب تو ذاتی کمالات، اور طہارت نفس
کے سبب ملتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ محض اپنے
فضل و کرم سے اس شخص کو عنایت فرماتے
ہیں جس کے اندر اس کی پوری طور پر اہلیت
پائی جاتی ہے اور بعض اہلسنت نے اس
بات کی تصریح فرمائی ہے کہ منصب رسالت

للاستعداد الذاتى و
ولا يستلزم الايجاب الذى
يقوله الفلاسفة لانه
سبحانه ان شاء اعطى و
ان شاء امسك وان استعد
المحل وما فى المواقف من
انه لا يشترط فى الارسال
الاستعداد الذاتى بل
الله يختص برحمته
من يشاء محمول على
الاستعداد الذاتى
الموجب فقد جرت
عادة الله تعالىٰ ان
يبعث من كل
قوم اشرفهم و
اطهرهم جبلة
وتمام البحث

و نبوت ذاتی صلاحیت کے تابع ہوتا ہے
لیکن اس کا مطلب لازمی وجوب نہیں ہے،
وہ اہلیت والے کے لئے رسول بنا دینا خدا
کے ذمہ ضروری ٹھہرے) جیسا کہ فلاسفہ کا
کہنا ہے کیونکہ (اہلیت و استحقاق کے
باوجود اگر خدا چاہے تو دے اور اگر
نہ چاہے تو نہ دے اگرچہ محل میں استعداد
موجود ہو۔ باقی مواقف کے اندر جو لکھا
ہے کہ رسالت عطا کرنے کے لئے ذاتی
استعداد شرط نہیں ہے بلکہ اپنی
رحمت سے جس کو چاہتا ہے خاص کر لیتا
ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ استعداد
ذاتی شرط نہیں ہے جو لازمی طور پر
رسالت کو واجب کر دے کیونکہ عادۃ
اللہ اسی طرح جاری ہے کہ ہر قوم سے
رسالت کا انتخاب اس شخص کے حق میں ہوتا
ہے جو ان میں اشرف و اعلیٰ اور پاکیزہ

فی موضعہ   فطرت ہوتا ہے اور مسئلہ کی مکمل تفصیل
(روح المعانی صفحہ ۲۳،۲۲ ج ۸)   اپنے مقام میں مل سکتی ہے۔

دوسری آیت جس طرف شاہ ولی اللہ صاحب نے اشارہ فرمایا تھا وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے متعلق ہے کہ قبل نبوت زلیخا کے ساتھ ان کو جو واقعہ پیش آیا وہاں عصمت خداوندی ہی نے ان کو گناہ سے محفوظ رکھا ورنہ اس کے سارے اسباب و دواعی مکمل ہو چکے تھے۔ خدائی حفاظت شامل حال نہ ہوتی تو بچنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

ولقد ھمت بہ وھم بھا لو   وہ زلیخا تو پختہ ارادہ کر ہی چکی تھی اور
لا ان رأ برھان ربہ   وہ (حضرت یوسف علیہ السلام) بھی کر لیتے اگر
(پارہ ۱۲ رکوع ۱۳)   اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتے۔

یعنی خدائی عصمت ہی درمیان میں حائل ہو گئی تھی جس نے حضرت یوسفؑ کو اس اقدام سے باز رکھا۔ خود زلیخا کا بیان بھی قرآن میں اس طرح منقول ہے فرمایا گیا۔

ولقد راودتہ عن   میں نے تو اس کو بہلانا پھسلانا
نفسہ فاستعصم   چاہا مگر اس نے عصمت کو کام میں لایا۔
. . . .   (اس لئے محفوظ رہا)

عصمت قبل نبوت کی اس سے واضح اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ خود
واقعہ کی تعبیر میں خداوند تعالیٰ نے "استعصم" کا لفظ استعمال فرمایا ہے تاکہ
قبل نبوت عصمت کا واضح ثبوت ہو جائے۔ ان وضاحتوں کے سامنے
آجانے کے بعد عصمت کے لازم ذات ہونے سے انکار کیلئے کوئی
گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ہے کیونکہ دلائل سے ثابت ہو گیا کہ قبل نبوت
بھی اللہ تعالیٰ کی خصوصی توجہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہوتی ہے اور
وہ ہمیشہ خداوند تعالیٰ کی نگرانی اور اسی کی حفاظت میں ہوتے ہیں۔ اس
حقیقت کے تسلیم کرنے میں اہلسنت میں سے کسی ایک فرد کا بھی کوئی اختلاف
نہیں ہے البتہ اس عصمت کی قوت اور اس کا عمل کس حد تک گناہوں سے
روکتا ہے اس مسئلہ میں کچھ تفصیل ہے۔

کیا عصمت زمانۂ نبوت و رسالت کے پہلے بھی ہوتی ہے

گذشتہ صفحات میں جو تحقیقات تحریر کی جا چکی ہیں ان سے یہ حقیقت بالکل بے غبار ہو گئی
ہے کہ عصمت زمانۂ نبوت کے پہلے سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے
کہ نبی اپنی پہلی زندگی پر چیلنج کرتا ہے اور اس کو اپنی بے گناہی اور صداقت
کی دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے۔

فقد لبثت فیکم عمرا میں تمہارے درمیان ایک زمانہ تک

من قبلہ ۲ فلا تعقلون	(دعویٰ نبوت و رسالت کے) پہلے بھی رہ چکا
(سورۂ یونس)	ہوں کیا اتنا بھی نہیں سمجھتے ہو۔

علامہ آلوسی علیہ الرحمہ اسی آیت کی تفسیر میں ایک معنیٰ یہ بھی بیان فرماتے ہیں۔

والمعنیٰ قد عشت فیمابین	مطلب یہ ہوا کہ میں نے تمہارے ہی درمیان
ظهرا نیکم قبل الوحی لا	رہ کر وحی کے قبل بھی ایسی زندگی گذاری ہے
اتعرض لاحد بتحکم ولا	کہ کبھی کسی سے زیادتی کے ساتھ کوئی تعرض نہیں
جدال ولا اخوم حول	کیا اور نہ جنگ و جدال کیا اور کسی موقع پر ایسی
مقال فیہ شائبۃ	بات کے قریب بھی نہ پھٹکا جس میں جھوٹ کے
شبهۃ فضلا عما	شبہ کا بھی کوئی شائبہ ہو اور جھوٹ یا الزام
فیہ کذب وافتراء الا	تراشی تو بڑی چیز ہے کیا تم لوگ ان باتوں
تلاحظونہ (روح المعانی ص ۱۱۶)	پر غور نہیں کرتے ہو۔

یہ آیتیں اس بات کا واضح ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ زمانہ نبوت کے قبل بھی کوئی نبی عام انسانوں کی طرح نہیں ہوتا ہے۔ ایک نبی کی ذات کے درمیان اور دوسرے انسانوں کے درمیان جو واضح فرق ہے اس کو تسلیم نہ کرنا سپلے درجہ کی جہالت کے سوا کچھ نہیں رہی یہ بات کہ زمانۂ نبوت سے قبل یہ عصمت ان کی ذات کو کن کن گناہوں سے محفوظ رکھتی ہے یہ ایک تفصیل طلب مسئلہ ہے

اتنی بات پر تو تقریباً پوری امت کا یا کم از کم اہلسنت کا بلا کسی اختلاف کے بالکل اتفاق و اجماع ہے کہ وہ قبل نبوت بھی کفر و شرک سے محفوظ ہوتے ہیں مسلم الثبوت اس کی شرح فواتح الرحموت کے حوالہ سے گذر چکا ہے کہ عقل کی رو سے قبل نبوت ہر گناہ کا صدور ممکن ہے لیکن یہ صرف عقل کی بات تھی واقعہ کیا ہے اور جو چیز عملاً وقوع پذیر ہوتی ہے وہ شرعی حکم کیا ہے علامہ محب اللہ بہاری مسلم الثبوت میں اور علامہ عبد العلی بحر العلوم اس کی شرح فواتح الرحموۃ میں گذشتہ عبارت کے متصلاً ہی بعد تحریر فرماتے ہیں۔

واما الواقع المتوارث من لدن آدم ابو البشر الی نبینا ومولانا افضل الرسل واشرف الخلق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ لم یبعث نبی قط اشرک باللہ طرفۃ عین قط وعلیہ نص الامام ابو حنیفہ فی الفقہ الاکبر

(فواتح الرحموت مع مسلم صفحہ ۳۳)

(یعنی اوپر جو کچھ تحریر ہوا وہ تو عقلی بات تھی لیکن جو وقوع پذیر ہونیوالی متوارث حقیقت ہے وہ یہ ہے کہ ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر ہمارے آقا اشرف الخلق حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم تک کسی ایسے شخص کو نبی نہیں بنایا گیا جو کسی وقت میں ایک لمحہ کے لئے بھی شرک میں مبتلا رہ چکا ہو۔ اس بات کی تصریح امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فقہ اکبر میں فرمائی ہے۔

معلوم ہوا کہ شرعاً کسی نبی کا قبل نبوت یا بعد نبوت کفر و شرک میں ایک لمحہ کے لئے بھی مبتلا ہو جانا ممکن نہیں ہے شرح مواقف میں علامہ سید شریف جرجانی رحمۃ اللہ علیہ تصریح فرماتے ہیں۔

فاما الکفر فاجتمعت الامۃ علیٰ عصمتہم منہ (رازی عصمۃ الاسلام صفحہ ۲۲۹/۲۶)

جہاں تک کفر کا تعلق ہے تو اس سے معصوم ہونے پر پوری امت کا اتفاق ہے

حاشیہ نبراس میں ہے۔

واما الکفر فاجتمعت الامۃ علیٰ عصمتہ عنہم قبل النبوۃ وبعدھا ولاخلاف لاحد منہم الا من شذ (حاشیہ نبراس صفحہ ۲۵۲)

بہر حال کفر و شرک تو اس سے معصوم ہونے پر پوری امت متفق ہے قبل نبوت بھی اور بعد نبوت بھی سوا ان کے جو سواد اعظم سے الگ ہو چکے ہیں

امام رازیؒ فرماتے ہیں۔

والکفر غیر جائز بالاجماع (تفسیر کبیر صفحہ ۴۴) (انبیاء کیلئے) کفر بالاجماع ناممکن ہے

علامہ تفتازانی شرح عقائد میں تحریر فرماتے ہیں۔

انہم معصومون عن الکفر قبل الوحی وبعدہٗ بالاجماع (شرح عقائد صفحہ ۱۰۳ مطبوعہ رشیدیہ)

یقیناً انبیاء علیہم السلام وحی سے پہلے اور بعد دونوں حالتوں میں کفر سے بالاجماع معصوم ہیں

محقق علی الاطلاق ملا علی قاری شرح فقہ اکبر میں لکھتے ہیں۔

فان الانبیاء معصومون عن الکفر مطلقاً بالاجماع (شرح فقہ اکبر صفحہ ۵۶)

بلاشبہ انبیاء کرام علیہم السلام علی الاطلاق (یعنی قبل بعثت و بعد بعثت دونوں حالتوں میں) کفر و شرک سے باجماع امت معصوم ہوتے ہیں

علامہ آلوسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ۔

فالانبیاء معصومون عن الکفر قبل النبوۃ وبعدھا (روح المعانی ص ۶۲/ ۱۹ج)

انبیاء کرام علیہم السلام نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد بھی کفر سے معصوم ہوتے ہیں۔

ایک طالب حق اور منصف مزاج کے لئے یہ ٹھوس حوالے کافی سے زیادہ ہیں لیکن معاند اور ہٹ دھرم سے صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

یہ تمام عبارتیں اپنے مفہوم اور مراد میں بالکل واضح اور صاف ہیں۔ کسی مزید تشریح کی مطلقاً کوئی ضرورت نہیں ہے البتہ یہ چیز ذہن نشین ہو جانی ضروری ہے کہ یہ مسئلہ اجماعی اور پوری امت کا متفق علیہ ہے۔ اگر کسی کا اختلاف ہے تو وہ ایسے ہی لوگ ہیں جن کا سواد اعظم سے خارج ہونا قطعی اور امت میں شامل ہونا خود ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ چنانچہ علامہ آلوسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ۔

لایکاد یقول بذلک الا الازارقہ من الخوارج فانھم علیھم مایستحقون جوزوا الکفر حیثا ھم فما دونہ

انبیاء سے کبیرہ کے ارتکاب کا کوئی بھی خوارج کے فرقہ ازارقہ کے علاوہ اس بات کا قائل نہیں ہے کیونکہ یہ فرقہ علیہ ما علیہ معاذ اللہ انبیاء علیہم السلام کے لئے کفر کا

اولیٰ ما التجویز (روح المعانی صفحہ ۲۲۴ جلد ۱۲)	ارتکاب جائز قرار دیتا ہے تو اس سے کم درجہ کا گناہ بدرجۂ اولیٰ جائز قرار دیگا۔

فرقۂ ازارقہ ہی کی طرح شیعہ حضرات تقیہ جائز قرار دیتے ہیں مگر امام رازیؒ نے کہا ہے کہ صرف تقیہ کے طور پر کفر کو جائز قرار دینا صرف ان میں سے فرقہ امامیہ کا مسلک ہے اسی طرح انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ خوارج کے فرقہ فضلیہ کے نزدیک بھی انبیاء کے لئے کفر جائز ہونا چاہیئے فرماتے ہیں۔

وقالت الفضیلیة من الخوارج	خوارج میں سے فرقہ فضلیہ کا کہنا ہے کہ
انهم قد وقعت منهم	انبیاء کرامؑ سے گناہوں کا صدور ہوا ہے،
الذنوب والذنب عندهم	اور ہر گناہ، ان کے نزدیک کفر و شرک ہے
کفر و شرک فلا جرم	پس بلاشبہ یہ لوگ اس بات کے قائل ہوئے
قالوا بوقوع الکفر واجازت	کہ انبیاء علیہم السلام سے کفر کا وقوع بھی
الامامیه علیهم اظهار الکفر	ہوتا ہے اور شیعہ کے فرقہ امامیہ نے بطور
علیٰ سبیل التقیه (تفسیر کبیر صفحہ ۳۱۹ ج ۱۲)	تقیہ کفر انبیاءؑ کیلئے جائز رکھا ہے۔

فرقہ ازارقہ اور فضلیہ کی طرح مولانا مودودی نے بھی انبیاء کرام علیہم السلامؑ کے لئے کفر و شرک کا جواز و وقوع درست قرار دیا ہے جس کی تفصیلی بحث آئندہ صفحات میں آنیوالی ہے یہاں تو صرف یہ بات ذہن

نشین کرنا مقصود ہے کہ تفضیلیہ اور ازارقہ کے علاوہ تمام اسلامی فرقے صد ماء اعتقادی وعملی مسائل میں اختلاف کے باوجود اس نکتہ پر متفق ہو جاتے ہیں کہ کسی نبی سے زمانۂ نبوت کے پہلے یا بعد کسی وقت کفر وشرک کا وقوع صدور نہیں ہوا ہے اگر اس اجماعی عقیدہ سے اختلاف ہے تو صرف مولانا مودودی صاحب کو ہی اختلاف ہے بلکہ اہلسنت والجماعت کا تو مختار مسلک یہ ہے کہ کفر وشرک کی ہی طرح تمام کبائر کے عمداً ارتکاب سے بھی قبل نبوت انبیاء معصوم ہوتے ہیں۔

مذہب مختار کے مطابق باقصد | انبیاء قبل نبوت کبائر سے بھی معصوم ہوتے ہیں

کبائر سے معصوم ہونے میں اہلسنت کے درمیان تو کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ شیعہ حضرات اور اکثر معتزلہ بھی قبل نبوت کبائر کے عمداً وقوع سے نبی کو معصوم ہی مانتے ہیں البتہ بعض معتزلہ وغیرہ اس سے اختلاف رکھتے ہیں لیکن وہ اہلسنت اور امت کے سواد اعظم سے چونکہ خارج ہیں اس لئے ان کے اختلاف سے کسی اجماعی مسئلے پر اثر نہیں پڑتا۔

زیادہ تر علماء اہل سنت | سہواً کبائر سے قبل نبوت معصوم ہونا مختلف فیہ ہے

لہ روح المعانی صفحہ ۲۷۲ ج ۱

قبل نبوت سہواً کبائر کا صدور جائز مانتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اسی کو مختار و صحیح بھی قرار دیا ہے لیکن اکثر محققین سہواً کبائر سے بھی قبل نبوت معصوم ہونے کو صحیح و مختار قرار دیتے ہیں اس جگہ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ جن لوگوں نے کبائر کا صدور قبل نبوت یا بعد نبوت جائز قرار دیا ہے انھوں نے اس کے ساتھ ہی ساتھ دو باتوں کی تشریح بھی کی ہے اول یہ کہ اتفاقی طور پر اگر کسی کبیرہ کا صدور ہو جاتا ہے تو فوراً تنبیہ کر دی جاتی ہے اور وہ اس پر قائم نہیں رہ پاتے بلکہ صدور کے پہلے ہی ارادہ اور خیال پیدا ہوتے وقت ہی ان کو تنبیہ ہو جاتی ہے اور وہ اس سے باز رہتے ہیں۔ اس شرط کو ملحوظ کر لینے کے بعد دونوں خیالوں کے درمیان کوئی اختلاف یا جوہری فرق باقی نہیں رہ جاتا چنانچہ عصمت کے اجماعی قول اور بعضوں کے اس اختلاف کے درمیان تطبیق کرتے ہوئے ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں۔

والجمهور جوزوا وقوع الكبائر سهواً والصغائر عمداً لكن المحققين منهم اشترطوا ان ينبهوا عليهم فينتهوا عنه فعلى هذا قول الجمهور لا ينافي الاجماع المذكور (مرقات ص۱۲۰)

جمہور نے کبائر کا سہواً اور صغائر کا قصداً وقوع جائز مانا ہے لیکن ان کے محققین یہ شرط لگاتے ہیں کہ ایسے امور پر انبیاء کرام کو متنبہ کر دیا جاتا ہے اور وہ ان سے رک جاتے ہیں لہٰذا اس توجیہ کے بعد جمہور کا قول مذکور اجماع کے خلاف نہیں رہتا ہے۔

قائلین جواز نے جو دوسری بات اس جگہ ملحوظ رکھی ہے اس کو سامنے رکھنے کے بعد بھی یہ اختلاف ختم ہو جاتا ہے کیونکہ یہ حضرات اس بات کی تصریح فرماتے ہیں کہ یہ فعل صرف صورۃً گناہ نظر آتا ہے ورنہ درحقیقت یہ سرے سے کوئی گناہ ہے ہی نہیں اگرچہ اپنی ظاہری شکل وصورت کے لحاظ سے گناہ معلوم ہوتا ہے لیکن گناہ کی حقیقت اور معنویت کا اس میں کوئی نام ونشان نہیں ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہ حضرات اس فعل کو لفظ زلتؒ سے تعبیر کرتے ہیں تاکہ اس کے حقیقی گناہ نہ ہونے کی طرف اشارہ قائم رہے چنانچہ اسی مسئلہ کے ذیل میں شمس الائمہ سرخسی زلت کی وضاحت فرماتے ہیں۔

واما الزلة فلا يوجد فيها القصد الى عينها ولكن يوجد القصد الى اصل الفعل لانها اخذت من قولهم زلت الرجل في الطين اذا لم يوجد القصد الى الوقوع

زلت میں خاص اسی کا قصد نہیں پایا جاتا اگرچہ اصل فعل کا قصد ہوتا ہے کیونکہ لفظ زلت اہل عرب کے اس مقولہ سے ماخوذ ہے کہ آدمی کیچڑ میں پھسل گیا جب کہ گرنے کا یا اس میں گر کر پڑے رہنے کا کوئی قصد نہیں ہوتا اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ

؎ وكلهم من الحنفية والشافعية جوزوا الزلة فيها اى الكبائر والصغائر بعد النبوة وقبلها بان يقصد المباح فيلزم معصية كوكز موسى عليه السلام القبطي (فواتح الرحموت باختصار صفحہ ۳۹)

ولا الی الثبات بعد الوقوع ولکن وجد القصد الی المشی فی الطریق وانما یواخذ علیها لانها لاتخلوا عن نوع تقصیر یمکن للمکلف الاحتراز عنه عند التثبت واما المعصیۃ الحقیقیہ فہی فعل حرام یقصد الی نفسہ مع العلم بحرمتہ (تلویح ص۲۰۰)

کے راستہ پر چلنے کا قصد ضرور ہوتا ہے مگر زلّت پر مواخذہ ہوتا ہے اس لئے کہ یہ ایسی کوتاہی سے خالی نہیں ہے کہ مکلف ہوشیاری کے ذریعہ جس سے بچ سکتا تھا بہرحال جہاں تک حقیقی معصیت کا تعلق ہے تو یہ فعل حرام کو اس کے جرم ہونے کا علم رکھنے کے باوجود بالارادہ کرنے کا نام ہے ۔

اس عبارت سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ اس فعل کو حقیقی گناہ کے معنیٰ میں یہ لوگ بھی تسلیم کرنے کے لئے کسی طرح آمادہ نہیں ہیں ۔

گناہ کی دو قسمیں ہیں اس جگہ یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ گناہ کی ایک قسم تو وہ ہے کہ جس پر اس کے اثرات اور نتائج کا ترتب ہوتا ہے جس کو حقیقی گناہ کہنا چاہیئے اس گناہ سے قبل نبوت یا بعد نبوت انبیاء کرام کے معصوم ہونے میں قائلین جواز کو بھی کوئی اختلاف نہیں ہے البتہ وہ امور جو اپنی صورت اور ظاہر کے لحاظ سے گناہ نظر آتے ہیں اگرچہ گناہ کے آثار ونتائج کا ان پر ترتب نہیں ہوتا ۔ اس ظاہری

گناہ کا وقوع یہ حضرات جائز تصور کرتے ہیں چنانچہ علامہ عبد العلی بحر العلوم اسی مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

(اعلم انہ کما یجوز علیہم الصلوٰۃ والسلام الزلۃ یجوز الخطاء فیفعلون فیما یکون معصیۃ لو لم یکن خطأ وکذا السہو۔ (فواتح الرحموت صفحہ ۳۹۰)

معلوم ہونا چاہیے کہ انبیاء کرام علیہم السلام سے جس طرح زلّت کا وقوع جائز ہے اسی طرح خطا بھی جائز ہے۔ اس سے وہ ایسی چیز کے مرتکب ہو سکتے ہیں کہ اگر وہ فعل خطا واقع نہ ہوا ہوتا تو گناہ تصور کیا جاتا اور خطا ہی کی طرح ان سے سہو بھی ہو سکتا ہے

اس عبارت میں اس بات کی تشریح کر دی گئی ہے کہ اس زلّت خطا یا سہو کو حقیقی معصیت نہ سمجھنا چاہیے۔ رہی یہ بات کہ ان چیزوں کو ہم حقیقی معصیت کیوں نہیں کہہ سکتے تو اس کی وجہ علامہ عبد العلی اشارۃً یہ بیان فرماتے ہیں کہ۔

والسر فی جواز ذالک انہ لیس المعصیۃ حقیقۃً (فواتح الرحموت صفحہ ۳۸۹)

ان امور کے جائز ہونے کا اصل راز یہ ہے کہ در حقیقت یہ گناہ ہیں ہی نہیں۔

یہ امور گناہ کیوں نہیں ہیں اس کی تشریح اس طرح فرماتے ہیں۔

ثم الزلۃ لیس فیہا عصیان من وجہ بل ھی مباح

پس زلّت ایسے ہی خطا اور سہو کسی طرح بھی نافرمانی کے ہم معنی نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک

کما قال اللہ تعالیٰ و ما کان لمؤمن ان یقتل مومنا الا خطاءً۔ (فواتح الرحموت صفحہ ۳۹)

امر مباح ہے جیسا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کسی مومن کے لئے (وا نہیں کہ وہ صاحب ایمان کو قتل کر ڈالے الّا یہ کہ یہ فعل خطا سے ہو جائے۔

درحقیقت یہ اختلاف لفظی ہے

مذکورہ وضاحتوں کے سامنے آجانے کے بعد یہ بات بالکل روشن ہو جاتی ہے کہ ان دونوں راویوں کے درمیان کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے بلکہ صرف تعبیر کا اختلاف ہے کیونکہ جو لوگ سہواً کبائر کا صدور جائز نہیں مانتے وہ حقیقی گناہ ان کو تصور نہیں کرتے ہیں اس لئے گناہ سے ان کی تعبیر دہ پسند نہیں کرتے اور ان کی نفی کرتے ہیں لیکن جو لوگ اس تعبیر کو روا رکھتے ہیں وہ اس کے حقیقی گناہ ہونے کی نفی کرتے ہیں۔ اور ایسے امور کے حقیقی گناہ نہ ہونے پر ان کے نزدیک کچھ دلائل بھی ہیں۔ مثلاً علامہ عبدالعلی کی آخری عبارت میں ایک دلیل کی طرف اشارہ موجود ہے چنانچہ انھوں نے آیت و ما کان لمؤمن ان یقتل مومنا الا خطاءً سے اپنے موقف پر استدلال کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر فعل قتل خطاءً

نہ ایسے ہی فرمایا گیا ولیس علیکم جناح فیما اخطاتم بہ (احزاب) جو کام تم نے غلطی سے کر لیئے ہیں ان میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے ۱۲

واقع ہو جائے تو اس کا شمار اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی اس روشنی میں حقیقی گناہ کے ذیل میں نہیں ہوگا اس کی مزید وضاحت کے لئے اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ ایک شخص بالقصد والارادہ تو ایک مباح اور جائز کام کرنا چاہتا ہے لیکن وہ ہو گیا حرام اور ناجائز اس میں اس شخص کا کیا قصور ہے کہ اس سے مواخذہ کیا جائے مثلاً کسی نے دور سے ایک شکار پر تیر چلایا لیکن شکار تو سامنے سے ہٹ گیا اچانک ایک آدمی نشانہ پر آ گیا اور تیر اس کو لگ گیا ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس شخص کا کیا قصور ہے اس نے تو شکار پر تیر پھینکا تھا جو ایک جائز اور مباح کام ہے لیکن تیر لگ گیا انسان کو جو اگرچہ جائز نہیں ہے مگر تیر چلانے والا بے قصور ہے کیونکہ اس کا ارادہ یہ نہیں تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہی صورت پیش آئی تھی کہ ظالم شخص کو ظلم سے روکنے اور ایک مظلوم کی مدد کرنے کے لئے جو بالکل جائز اور مباح امر تھا انھوں نے اس شخص کو ایک گھونسہ مارا لیکن بدقسمتی سے وہ مر ہی گیا ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا ارادہ جان مارنے کا نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ قرآن میں اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے واقعہ کی تعبیر کی گئی چنانچہ یہ نہیں ارشاد فرمایا گیا کہ "قتلہ موسیٰ" کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس کو مار ڈالا یا "ذبحہ موسیٰ" کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس کو قتل کر ڈالا یا "اماتہ موسیٰ ضربا" کہ موسیٰ نے اس کو اس قدر مارا کہ مر گیا۔ چونکہ موسیٰ علیہ السلام کا ارادہ تو صرف تنبیہ اور ظلم سے روکنے کا تھا اس لئے

صرف ایک گھونسہ مارا مگر اتفاق سے اس کی موت اسنتے ہی میں ہوگئی۔ اس فرق کو واضح کرتے ہوئے واقعہ کی تعبیر ان الفاظ میں کی ہے۔

فوکزہ موسیٰ فقضیٰ علیہ ۔ — موسیٰؑ نے اس کو (صرف ایک ہی) گھونسہ مارا لیکن اس کا (اتنے ہی میں) کام تمام ہوگیا۔

یہی وہ باریک نکتہ تھا جسکو فرعون نہیں سمجھ سکا۔ جب اس نے موسیٰ علیہ السلام پر اس قتل کا جرم عائد کیا تو انھوں نے اس کج فہمی کو محسوس کرتے ہوئے یا اصل کام جو اس وقت تبلیغ و رسالت کا تھا جس کے لئے اس وقت دربار فرعونی میں تشریف لے گئے تھے اس موضوع سے مسئلہ گفتگو کے ہٹ جانے کا اندیشہ تھا اس لئے بات مختصر کرلی اور فرمایا جس وقت مجھ سے یہ فعل ہوا تھا میں رسول نہیں تھا یا یوں کہیئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس وقت بھی اس نکتہ کی طرف فرعون کو متوجہ کیا لیکن ان کی بات کو اقرار جرم پر محمول کرکے مردود حضرت موسیٰؑ کے ذمہ الزام لگاتا ہی رہا کیونکہ حضرت موسیٰؑ کے اس ارشاد کا مطلب مفسرین نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے۔

وقال فعلتہا اذا و انا من الضالین ای الجاہلین بانہا تبلغ القتل (تفسیر مدارک صفحہ ۲۱۷) — حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ میں نے کیا تھا ضرور لیکن میں اس وقت اس سے بے خبر تھا کہ معاملہ موت تک پہونچ جائے گا۔

یعنی گھونسہ چلانے کا مقصد جان سے مارنا نہیں تھا بلکہ محض دفع ظلم کیلئے

مجھے کیا خبر تھی کہ ایک ہی گھونسہ میں مر جائے گا لہٰذا قتل کردینے کا ارادہ نہیں تھا اس لئے یہ الزام درست نہیں اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق بخاری و مسلم کی یہ روایت جو مشکوٰۃ صفحہ ۵۰۶ پر ہے کہ

لم یکذب ابراھیم الا	حضرت ابراہیم سے تین مواقع کے علاوہ کبھی
ثلث کذبات	کذب کا صدور نہیں ہوا۔

اس کی شرح میں ملا علی قاریؒ تحریر فرماتے ہیں۔

لانها كانت صورتها صورة	چونکہ اس کی ظاہری صورت کذب کی تھی
الكذب سميت كذبات ...	اس لئے لفظ کذب سے تعبیر کر دیا گیا ورنہ
واما في نفس الامر فليست كذبات (حاشیہ مشکوٰۃ صفحہ ۵۰۶)	حقیقتاً یہ کذب نہیں تھا۔

اس عبارت سے بھی روز روشن کی طرح واضح ہوگیا ہے کہ گناہ کی دو قسم صورۃً اور حقیقۃً کرنا صحیح ہے اور جن محققین نے قبل نبوت یا بعد نبوت اس کا صدور تسلیم کیا ہے وہ اس تقسیم کے قائل ہیں سہواً کبیرہ کے سلسلہ میں ان وضاحتوں کے سامنے آجانے کے بعد یہ چیز از خود واضح ہو جاتی ہے کہ اس اختلاف میں کوئی جوہری اور معنوی فرق نہیں ہے کیونکہ جو لوگ سہواً کبیرہ کا صدور ہی صرف صورۃً گناہ مانتے ہیں حقیقتاً گناہ نہیں کہتے ان کے نزدیک یہ عصمت کے بھی منافی نہیں ہے اس لئے کہ عصمت تو حقیقی گناہوں سے روکنے والی صفت کو کہتے ہیں اور جو لوگ اس کو حقیقی گناہ

سمجھتے ہیں وہ اس کا صدور ہی نہیں مانتے لہٰذا اختلاف صرف لفظی ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ جو لوگ قبل نبوت یا بعد نبوت کبیرہ گناہوں کا صدور جائز مانتے ہیں وہ بھی اس بات کی تصریح فرماتے ہیں کہ جو گناہ صغیرہ ہیں اگر وہ خست و دنائت اور رذالتِ طبع پر دلالت کرتے ہیں تو ان کا صدور بہر حال قبل نبوت بھی ممکن و روا نہیں ہے گو یا عیب اور نفرت کا باعث جو امر ہے وہ سب کے نزدیک بالاتفاق گناہ اور قابل نفرت ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔

واما الصغائر المنفرة كسرقة لقمة او حبة وتسمى صغائر الخسة فهم معصومون عنها مطلقا وكذا من غير المنفرة كنظرة الاجنبية عمدًا۔

(مسامرہ ص ۹۷)

جہاں تک قابل نفرت صغائر کا معاملہ ہے جیسے ایک دانہ یا ایک لقمہ کی چوری کرنا اس کو صغائر خسیسہ بھی کہتے ہیں تو انبیاء علیہم السلام علی الاطلاق (یعنی عمداً و سہواً) معصوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح صغائر نا قابل نفرت سے بھی بشرطیکہ قصداً ہو معصوم ہوتے ہیں جیسے کسی اجنبی عورت پر نگاہ ڈالنا۔

علامہ تفتازانیؒ فرماتے ہیں۔

والحق منع ما يوجب النفرة كعهر الامهات والفجور

اور حق بات یہ ہے کہ جو قابل نفرت گناہ ہیں جیسے ماں کے ساتھ زنا کرنا یا بے حیائی کے کام

(۲) الصغائر الدالۃ علی الخسۃ
(شرح عقائد صفحہ ۱۲۰)

اور خسیس قسم کے صغائر یہ سب صادر نہیں ہوتے۔

بعد نبوت بھی عصمت میں یہی تفصیل ہے

قاضی ثناء اللہ پانی پتی اپنی مشہور درسی کتاب مالابدمنہ میں تحریر فرماتے ہیں

انبیاء ہمہ معصوم اند از صغائر وکبائر
(مالابدمنہ صفحہ ۹)

تمام انبیاء علیہم السلام کبائر و صغائر سے معصوم ہیں

اسی جگہ مالابدمنہ کے فارسی حاشیہ میں یہ تفصیل موجود ہے۔

مذہب جمہور اہل سنت کہ انبیاء در زمان نبوت معصوم اند از صغائر عمداً وسہواً و خطأً و از کبائر عمداً۔ کذا فی شرح المواقف للجرجانی و شرح العقائد للتفتازانی و در شرح قصیدہ امالی مذکور است صدور کبیرہ و صغیرہ عمداً قبل وحی و بعد آں از انبیاء ممنوع، اما صدور صغیرہ سہواً و ندرۃً قبل از نبوت جائز است و بعد آں۔
(حاشیہ مالابدمنہ صفحہ ۹)

جمہور اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام نبوت کے زمانہ میں عمداً سہواً اور خطأً کبائر سے معصوم ہوتے ہیں جیسا کہ علامہ جرجانی کی شرح مواقف اور علامہ تفتازانی کی شرح عقائد میں ہے اور شرح قصیدہ امالی میں لکھا ہے کہ صغیرہ و کبیرہ کا عمداً وقوع وحی کے پہلے یا وحی کے بعد جائز نہیں ہے لیکن شاذ و نادر طریقہ پر سہواً صغیرہ کا وقوع قبل نبوت اور بعد نبوت بھی جائز ہے۔

خلاصہ یہ کہ اب تک کی جو تفصیلیں کبائر عمداً اور سہواً یا صغائر خسیہ کے متعلق آچکی ہیں ان کے اندر قبل نبوت اور بعد نبوت دونوں حالتوں میں حکم ایک ہی ہے البتہ صغائر کے متعلق اختلاف ہے لیکن حق یہی ہے کہ عمداً صغائر سے قبل نبوت اور بعد نبوت دونوں حالتوں میں معصوم ہوتے ہیں اور سہواً کے متعلق وہی اختلاف لفظی یہاں بھی موجود ہے جس سے نتیجہ پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حاصل بحث یہ ہو کہ یہ ہے حاصل انبیاء کرام ہر حالت میں جملہ گناہوں سے معصوم ہیں اور قبل نبوت یا بعد نبوت دونوں حالتوں میں ہر صغیرہ اور کبیرہ سے بحکم عصمت

حق یہی ہے کہ انبیاء ابتدائی معصوم ہیں

اب تک جو حوالے سامنے آگئے ہیں ان سے یہ بات واضح طریقہ پر سمجھ میں آچکی ہوگی کہ انبیاء کرام علیہم السلام کا زمانۂ نبوت کے پہلے سے ہی معصوم ہونا ایک مسلّم حقیقت ہے لیکن یہ بات اب تک صاف نہ ہوسکی کہ زمانۂ نبوت کے پہلے عصمت کے ثبوت کے لئے کوئی مقرر اور متعین وقت بھی ہے یا نہیں اگر ہے تو اہلسنت والجماعت کے نزدیک وہ کون سا وقت ہے جس سے عصمت کی ابتدا تسلیم کی جائے تو اس سلسلہ میں لوگوں کے خیالات مختلف ہیں۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر کبیر میں تحریر فرماتے ہیں۔

اختلف الناس فی وقت العصمۃ	عصمت کے وقت سے متعلق لوگوں کا اختلاف
علی ثلثۃ اقوال (احدھا)	ہے اور اس میں تین اقوال ہیں اول ان
قول من ذھب الی انھم	لوگوں کا قول ہے جو اس طرف گئے ہیں کہ

معصومون من وقت مولدهم	انبیاء معصوم ہوتے ہیں اپنی ولادت کے وقت
وهو قول الرافضة والثانيها قول	ہی سے یہ خیال شیعہ کا ہے دوم یہان لوگوں کا
من ذهب الى وقت عصمتهم وقت	قول ہے جو اس بات کی طرف گئے ہیں کہ بلوغ
بلوغهم ولم يجوزوا منهم	کے وقت سے ہی عصمت ہوتی ہے ان لوگوں نے
ارتكاب الكفر والكبيرة قبل النبوة	قبل نبوت کفر اور کبیرہ کے وقوع کو ناجائز
وهو قول كثير من المعتزلة وثالثها	مانا ہے اکثر معتزلہ کا یہی قول ہے۔ سوم یہان
قول من ذهب الى ان ذالك	حضرات کا قول ہے جو کہتے ہیں کہ انبیاء سے
لا يجوز وقت النبوة واما قبل النبوة	یہ چیزیں نبوت کے وقت سے ناجائز ہوتی
فجائز وهو قول اكثر اصحابنا	ہیں لیکن نبوت سے قبل جائز ہیں یہ قول ہمارے
قول ابي الهذيل وابي علي من	اکثر اصحاب کا ہے اور یہی رائے ابو ہذیل
المعتزلة (تفسیر کبیر صفحہ ۳۳۰/۱۲)	اور ابوعلی (جبائی) معتزلہ کا ہے۔

اس جگہ امام رازی نے مسئلہ سے متعلق جو تین اقوال تحریر کئے ہیں ان میں سے بعض امور غور طلب ہیں کیونکہ انھوں نے تیسرے قول کو اپنے اصحاب کی اکثریت کا قول قرار دیا ہے جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ اہلسنت والجماعت کا قول مختار یہی ہے حالانکہ یہ بات کسی طرح درست نہیں ہے اس لئے کہ اکابر محققین اور علماء اہلسنت والجماعت کی بے شمار تصریحات اس کے خلاف موجود ہیں جس میں اکثر اصحاب کے اس قول کے خلاف دوسرے

قول کو اصح الاقوال اور مذہب مختار بتایا گیا ہے اسی طرح قول اول کو اس جگہ امام رازی نے صرف شیعہ حضرات کا قول قرار دیا ہے حالانکہ یہ بات بھی درست نہیں ہے کیونکہ تنہا ان کا یہ قول ہرگز نہیں ہے بلکہ علمائے محققین کے نزدیک اہلسنت والجماعت کا مسلک مختار بھی یہی ہے جیساکہ آئندہ اس سلسلہ کے متعدد حوالوں سے یہ بات روشن ہو جائے گی۔ رہی یہ چیز کہ جو مذہب شیعوں کا ہے اہلسنت اسے کیونکر اختیار کر سکتے ہیں تو اس سوال کو بھی علما نے اپنی جگہ حل کر دیا ہے چنانچہ شرح عقائد نسفی کی مشہور و متداول شرح نبراس میں ہے۔

ان قلت فهذه العصمة مذهب الشيعة قلت اولاً لا باس في الاتفاق اذ مقصود المشائخ اتباع الوفاق وثانياً ان بين الفريقين بعد المشرقين لان الشيعة على تجويز الكفر تقية۔

(نبراس ص۵۵۴)

اگر تم یہ اعتراض کرو کہ یہ عصمت تو شیعوں کا مذہب ہے تو میں جواب دوں گا کہ کسی امر حق میں متفق ہو جانے سے کوئی حرج واقع نہیں ہوتا اس لئے کہ اکابر کا مقصد تو اتباع حق ہے بشیوں کی ہمنوائی مقصود نہیں ہے دوسری بات یہ بھی ہے کہ ہمارے اور شیعہ کے مذہب میں مشرق و مغرب کا فرق ہے اس لئے کہ وہ بطور تقیہ کفر تک کا وقوع جائز قرار دیتے ہیں[1]۔

---

[1] یجوزون علیهم الکفر تقیة عقلا وشرعا قبل النبوة وبعدها (فواتح الرحموت ص۳۸۷)

غرض یہ ہے کہ اس سلسلہ میں محققین اہلسنت والجماعت نے جو کچھ لکھا ہے ان سب کا حاصل یہی ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا وقت ولادت ہی سے معصوم ہونا مسلک حق ہے۔ نبوت کے بعد خود امام رازیؒ کے نزدیک بھی معصوم ہونا ہی مذہب مختار ہے چنانچہ تحریر فرماتے ہیں۔

والمختار عندنا انه لم يصدر	ہم اہل سنت کے نزدیک مختار یہ ہے کہ انبیاء
عنهم الذنب حال النبوة البتة لا	کرامؑ سے بحالت نبوت کوئی گناہ نہیں ہوتا نہ
الكبيرة ولا الصغيرة (تفسير كبير صفحہ ۳۸ ۱)	صغیرہ اور نہ کبیرہ[۱]

قبل نبوت معصوم ہونے کے سلسلہ میں حاشیہ ملا بدمنہ کے حوالے سے اہلسنت کا موقف گذشتہ صفحات میں نقل کیا جا چکا ہے مزید حوالے درج کئے جاتے ہیں حاشیہ نبراس میں ہے۔

والمختار عندنا انه لم يصدر	ہم اہلسنت کا مذہب مختار یہ ہے کہ انبیاءؑ
عنهم الذنب حال النبوة واما	علیہم السلام سے بحالت نبوت کسی طرح کا گناہ
قبلها فان الكبيرة لا تصدر	نہیں ہوتا اور نبوت کے پہلے کبیرہ گناہ عمداً
عمداً وفي صدور الصغيرة	نہیں ہوتا اور صغیرہ گناہ کے قبل نبوت صدور
اختلاف وفي دلائل هذه	میں اختلاف ہے اور ان مسائل سے متعلق دلائل

---

[۱] عصمتِ انبیاءؑ پر امام رازیؒ نے عقل ونقل سے ۱۲ دلیلیں قائم فرمائی ہیں۔ دیکھئے

تفسیر کبیر صفحہ ۳۲۰، ۲۲۱ / ۱۲۰

مسدکورة فی المطولات (حاشیہ نبراس) بڑی بڑی کتابوں میں موجود ہیں۔

مولانا صدیق حسن خاں صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

وذهب الاشاعرة الى ان الانبياء معصومون عن الكبائر مطلقاً اى عمداً وسهواً وعن الصغائر عمداً لكن صرح فى شرح المواقف (الانتقاد الرجیح صفحہ ۲۹)

اشاعرہ اس طرف گئے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کبیرہ گناہوں سے علی الاطلاق یعنی عمداً اور سہواً دونوں سے اور صغیرہ گناہوں کے عمداً ارتکاب سے معصوم ہوتے ہیں۔ شرح مواقف میں اسی طرح ہے۔

علامۃ الحسن ابن عبد المحسن اپنی کتاب «الروضۃ البہیۃ» میں رقمطراز ہیں۔

والامام ابو حنيفة ذكر فى الفقه الاكبر ان الانبياء عليهم الصلوٰة والسلام معصومون عن الصغائر والكبائر جميعاً وهو الحق وقيد بعض اصحابه بعد الوحى فتجوز الصغيرة على سبيل الندرة ثم يعود حالهم وقت الارسال الى الصلاح والسداد والنجاة

حضرت امام ابو حنیفہ علیہ الرحمہ نے فقہ اکبر میں لکھا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کبائر اور صغائر سب سے معصوم ہوتے ہیں اور یہ بالکل حق ہے مگر بعض حنفیوں نے اس کو وحی کے بعد کی قید کیا ہے لہٰذا (ان کے نزدیک) صغیرہ شاذ و نادر (قبل نبوت) صادر ہو سکتا ہے اور پھر نبوت ملنے کے وقت تک ان کی حالت بہتری اور درستگی کی طرف لوٹ جاتی ہے (بلکہ صغیرہ کا صدور بھی ناجائز ہو جاتا ہے)

الاشعری منعوا الکبائر وجوزوا الصغائر والحق المنع مطلقاً (الروضۃ البہیہ طبع اول ۱۳۲۲ھ صفحہ ۵۰ حیدرآباد)

اشاعرہ حضرات نے کبیرہ کا صدور کلیۃً ناجائز قرار دیا ہے اور صغیرہ گناہوں کو جائز قرار دیا ہے لیکن حق علی الاطلاق تمام گناہوں کا وقوع ناجائز ہونا ہی ہے ۔

علامہ تفتازانی نے قبل نبوت کبیرہ کے متعلق کہا تھا کہ اس کے عدم صدور پر کوئی دلیل نہیں ہے نیز صغائر کا صدور بھی قبل نبوت جائز رکھا تھا اسی لئے علامہ عبدالعزیز نے شرح کرتے ہوئے نبراس میں اس پر تنبیہ فرمائی ہے ۔

التنبیہ الاول المذکور فی کلام الشارح ھو مذھب عامۃ المتکلمین وخالفھم جمھور وجمع من العلماء فذھبوا الی العصمۃ عن الصغائر والکبائر قبل الوحی وبعدہ وھو المختار الی المنتھی شارح الفقہ الاکبر والشیخ عبدالحق محدث الدھلوی (نبراس صفحہ ۵۴۴)

پہلی تنبیہ یہ ہے کہ شارح کی عبارت میں جو مذکور ہے وہ عام متکلمین کا مذہب ہے لیکن اس کے برخلاف جمہور محققین اور علماء کی ایک جماعت ہے جو اس طرف گئی ہے کہ عصمت جملہ صغائر و کبائر سے قبل وحی اور بعد وحی دونوں حالتوں میں حاصل ہوتی ہے یہی مختار ہے ابوالمنتہی شارح فقہ اکبر اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے نزدیک بھی

تقریباً اہلسنت والجماعت کے تمام محققینؒ اس بات پر متفق ہیں کہ انبیاء علیہم السلام زمانۂ نبوت کے قبل اور بعد دونوں حالتوں میں جملہ صغائر و

له صاوی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے دیکھئے صاوی جلد ۲ صفحہ ۹۶ حضرت نانوتویؒ کے نزدیک بھی مختار یہی ہے ترجمان السنۃ صفحہ ۵۵ ج ۳

وکبائر سے معصوم ہوتے ہیں۔ محدث کبیر حافظ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

اذ الانبیاء معصومون قبل النبوۃ وبعدھا عن کبائر الذنوب وصغائرھا ولو سھوا علی ما ھو الحق عند المحققین وان کان الاکثرون علی خلافہ (مرقاۃ ص ۱/۱۶۰)

کیونکہ انبیاء کرامؑ قبل نبوت اور بعد نبوت جملہ صغائر اور کبائر سے اگرچہ سہواً ہی ہو بالکل معصوم ہوتے ہیں اس مذہب کے مطابق جو محققین کے نزدیک حق ہے چاہے اکثر لوگ اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں

ملا علی قاری نے ابن حجر کے اس قول پر اعتراض کرتے ہوئے اپنی رائے اس طرح ظاہر کی ہے۔

فالصحیح قول الجمہور وھو تجویز وقوع الکبائر من الانبیاء سھوا والصغائر عمدا بعد الوحی واما قبل الوحی فلا دلیل علی امتناع صدور الکبیرۃ وذھب المعتزلۃ الی امتناعھا ومنعت الشیعۃ صدور الصغیرۃ والکبیرۃ قبل الوحی وبعدہ (مرقاۃ صفحہ ۱/۱۶۰)

قول صحیح جمہور ہی کا قول ہے یعنی یہ کہ انبیاء کرامؑ سے نبوت کے بعد سہواً کبائر کا وقوع جائز ہے اور صغائر کا عمداً اور نبوت سے پہلے کبائر کے عدم صدور پر کوئی دلیل نہیں ہے معتزلہ عدم صدور کے قائل ہیں اور شیعہ نے قبل نبوت اور بعد نبوت دونوں حالتوں میں صغائر اور کبائر کے وقوع کی نفی کی ہے

. . . . . .

اس جگہ ملا علی قاری علیہ الرحمۃ نے اگرچہ محققین کے قول مختار سے بظاہر اختلاف کیا ہے اور اکثریت اور جمہور کی رائے کی تصحیح کی ہے لیکن ناظرین کو یاد ہوگا کہ گذشتہ صفحات میں یہ بات ملا علی قاریؒ کے حوالے سے ہی بیان کی جاچکی ہے کہ محققین کے اس اجماعی خیال اور اکثریت کی رائے کے درمیان کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے بلکہ دونوں قول کے درمیان تطبیق اور موافقت کی صورت ممکن ہے جیسا کہ ملا علی قاریؒ کی بیان کردہ تطبیق ناظرین کے سامنے آچکی ہے جس سے یہ بات بآسانی سمجھی جاسکتی ہے کہ اس جگہ ملا علی قاریؒ نے محققین کی رائے سے محض لفظی اختلاف کیا ہے ورنہ وہ بھی محققین کے قول کی طرف ہی رجوع کرچکے ہیں جیسا کہ مرقاۃ کے حوالے سے ان کی بیان کردہ تطبیق کے ذیل میں یہ بات گذر چکی ہے اس کے علاوہ پوری صراحت کے ساتھ ملا علی قاریؒ کا رجوع محققین کے قول کی طرف ثابت ہے اس لئے کہ انھوں نے خود بھی شرح فقہ اکبر میں محققین کے ہی مسلک کو اصح اور مختار تحریر فرمایا ہے ان کے الفاظ یہ ہیں۔

ثم هذه العصمة ثابتة للانبياء قبل النبوة وبعدها على الاصح (شرح فقه اكبر ص ٦٩)	پھر یہ کبائر وصغائر سے عصمت ثابت ہے انبیاء علیہم السلام کے لئے قول اصح کی بنیاد پر نبوت کے قبل بھی اور نبوت کے بعد بھی

صغیرہ گناہوں کے سلسلے میں بھی صحیح عدم جواز ہی ہے جیسا کہ ارباب

تحقیق اکابر علماء اہلسنت بالخصوص احناف نے اس کی تصریح کی ہے
فرماتے ہیں۔

وجاز تعمد غيرها اي غير الكبائر والصغائر الخسية بلا اصرار فانّ الاصرار على الصغيرة كبيرة عند اكثر الشافعية والمعتزلة ومنعه الحنفية اقول وهو الحق (مسلم الثبوت مع شرحہ صفحہ ٣٨٩)	صغائر خسیسہ اور کبائر ان دونوں کو چھوڑ کر بقیہ گناہ صغیرہ بلا اصرار قصداً اکثر شافعیہ اور معتزلہ کے نزدیک جائز ہے کیونکہ صغیرہ اصرار سے ان کے نزدیک کبیرہ ہو جاتا ہے لیکن احناف قصداً صغائر کی نفی کرتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ حق بھی یہی ہے۔

اس عبارت سے یہ حقیقت بے غبار ہو گئی کہ صغائر سے معصوم ہونا بھی حنفیہ کے نزدیک حق اور مختار ہے اسی طرح کبائر قبل نبوت کے سلسلہ میں بھی علاوہ ان امور کے جو انبیاء کرام کیلئے مخصوص ہیں۔ شریعت کا عام قاعدہ معلوم و مسلم ہے کہ زمانۂ بلوغ سے پہلے ہر شخص معصوم ہوتا ہے۔ بنابریں کم از کم قبل بلوغ انبیاء علیہم السلام کا غیر معصوم ہونا بالکل لغو اور بے معنی ہے۔ پس عام اصول کا تقاضہ یہی ہے کہ وہ زمانۂ بلوغ کے پہلے معصوم ہوں۔ باقی زمانۂ بلوغ کے بعد اور زمانۂ نبوت کے قبل جو درمیانی وقفہ ہے اس میں عصمت کا سلب ہو جانا نہ ثابت ہے اور نہ امر معقول ہے کیونکہ بلوغ سے پہلے کی حاصل شدہ عصمت کا باقی رہنا ہر طرح معقول و مناسب ہے۔ بالخصوص حالت سابقہ

کے منافی جبکہ کوئی نئی بات لاحق وحادث نہیں ہوتی بلکہ اس کے برخلاف جو نئے امور حادث ہوتے ہیں وہ بقائے عصمت ہی کے مقتضی ہیں بنا بریں اس درمیانی وقفے میں عصمت کا حاصل ہونا ہی قرین قیاس ہے بلکہ قرائن وشواہد بھی اسی کی تائید کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے لئے محققین اہلسنت والجماعت نے ولادت کے وقت سے ہی عصمت کا حاصل ہونا درست تسلیم کیا ہے چنانچہ علامہ عبدالعلی بحرالعلوم ارشاد فرماتے ہیں۔

هذا تمام الكلام في ما بعد النبوة واما قبل فالتحقيق وعليه اهل الله من الصوفية الكرام انهم معصومون ايضا من الكبائر والصغائر عمدا كيف لا وهم انما يولدون على الولاية ولا يمر عليهم طرفة عين وهم غير مشاهدين لله تعالى وولايتهم قوية من ولاية الاولياء الذين ولايتهم ماخوذة من ولايتهم ـ

یہ ساری گفتگو بعد نبوت سے متعلق تھی جہاں تک قبل نبوت کا معاملہ ہے تو تحقیقی بات یہ ہے اور صوفیائے کرام میں سے اہل اللہ بھی اسی پر ہیں کہ انبیاء کرام تمام صغائر و کبائر سے عمداً معصوم ہوتے ہیں اور کیوں نہ ہوں جب کہ ان کی ولادت ہی ولایت پر ہوتی ہے اور کوئی لمحہ ایسا گذرتا ہی نہیں جس میں مشاہدۂ حق نہ کرتے ہوں بلکہ ان کی ولایت تو اولیاء کرام کی ولایت سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے کیونکہ اولیاء کرام کی ولایت انہیں کی ولایت سے ماخوذ ہے اور اولیاء

الاولیاء محفوظون من المعاصی — معاصی سے محفوظ ہوتے ہیں۔ خوب سمجھ لو اور

فافہم وتثبت علیہ (فواتح الرحموت ص ۳۹۹) — اسی پر مضبوطی سے قائم رہو۔

ایک انصاف پسند اور جویائے حق کے لئے اتنے ٹھوس حوالوں کے سامنے آجانے کے بعد عصمتِ انبیاء کے مسئلے میں کسی شبہ کے باقی رہ جانے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے البتہ جن طبیعتوں نے قبولِ حق کی فطری صلاحیت کو ہی عناد و تعصب اور ہٹ دھرمی و بے شرمی کی بھینٹ چڑھا دیا ہے ان سے کلمۂ حق قبول کرنے کی کوئی توقع رکھنا فضول ہے بلکہ ان کے لئے یہ ساری قوتیں گانیاں بے سود و بیکار ثابت ہوں گی۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

بہر حال ناظرین نے محسوس کیا ہوگا کہ مولانا مودودی نے زمانۂ نبوت سے پہلے عصمت کا کلی طور پر انکار کر کے بلکہ زمانہ نبوت سے قبل انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے ہر طرح کا صغیرہ اور کبیرہ روا رکھ کر کتنی خطرناک گمراہی کا دروازہ کھول دیا ہے انھوں نے تمام اہلسنت کے مسلک کو چھوڑ کر ایک باطل نظریہ کو رواج دینے کی کوشش کی ہے۔

مولانا مودودی انبیاء کرام سے قبل نبوت کفر کا وقوع بھی جائز مانتے ہیں

مولانا مودودی نے انبیاء کرام کے لئے قبل نبوت عصمت کے اجماعی مسئلہ سے

نبی انکار نہیں کیا ہے بلکہ نبوت و رسالت کے پہلے ان سے ہر طرح کے گناہ حتیٰ کہ کفر و شرک کے وقوع پذیر ہونے کا عقیدہ بنایا ہے جس کا باتفاقِ امت غلط اور باطل ہونا واضح ہو چکا ہے بلکہ یوں کہیے کہ بار بار کی یاد دہانی اور توجہ دلانے کے باوجود مولانا مودودی نے انبیاء علیہم السلام کے لیے زمانۂ نبوت سے پہلے کفر و شرک کے واقع ہو جانے پر اصرار کیا ہے حالانکہ یہ عقیدہ سراسر کفر اور انتہائی خطرناک ہے جن باطل فرقوں نے اس عقیدہ کو اپنایا ہے ان کے متعلق علامہ عبد العلی بحر العلوم ارشاد فرماتے ہیں ۔

والحق انهم بمثل هذه الاقاويل خرجوا عن ربقة الاسلام ولهذا اراهم بعض اهل الله رضوان الله تعالى عليهم اجمعين على صورة خنزير (فواتح الرحموت ص۳۴۰)

سچی بات یہ ہے کہ یہ (شیعہ) حضرات اس قسم کے اقوال کی وجہ سے دائرۂ اسلام سے خارج ہو چکے ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض اولیاء اللہ علیہم الرحمہ نے ان کو سور کی شکل میں دیکھا ہے

رسائل و مسائل کے حوالے سے گذر چکا ہے کہ مولانا مودودی کے نزدیک حضرت آدم نے گناہ کبیرہ کیا ہے اور یہ بھی گذر چکا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قبل نبوت ان کے خیال میں ایک بہت بڑے گناہ (یعنی گناہ کبیرہ) کا ارتکاب کیا تھا جس کا بعد میں فرعون کے سامنے اقرار بھی کر لیا ہے اب یہ بھی پڑھیے کہ مولانا مودودی کے نزدیک انبیاء علیہم السلام قبل نبوت کفر و شرک میں بھی مبتلا ہوتے ہیں بالخصوص حضرت ابراہیم علیہ السلام تو قبل نبوت مولانا مودودی

کے نزدیک ضرور شرک میں مبتلا رہ چکے تھے۔

سنِ رشد تک حضرت ابراہیم علیہ السلام مودودی صاحب کے خیال میں مبتلا ر شرک تھے	مودودی صاحب کو ان کی اس خطرناک غلطی کی طرف متوجہ کرنے کے لئے

کسی نے سوال کیا۔

سوال:۔ آپ نے تفہیم القرآن میں سورۂ انعام رکوع ۹ سے متعلق ایک توضیحی نوٹ میں لکھا ہے کہ وہ حضرت ابراہیمؑ "ہٰذا ربی" کہنے سے شرک کے مرتکب نہیں ہوئے کیونکہ ایک طالب حق اپنی جستجو کی راہ میں سفر کرتے ہوئے بیچ کی جن منزلوں پر غور و فکر کرنے کے لئے ٹھہرتا ہے اصل اعتبار اس کا نہیں بلکہ اس سمت کا ہوتا ہے جس پر وہ پیش قدمی کر رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر نبوت[1] وہبی ہوتی ہے تو حضرت ابراہیمؑ کو عام انسانوں کی طرح خدا کے الٰہ ہونے یا نہ ہونے کے مسئلے میں شک اور تحقیق کی ضرورت نہ ہوتی اگر انھوں نے عام انسانوں کی طرح دماغی کاوشوں اور منطق و فلسفہ ہی سے اللہ کی الوہیت کو پایا تو نبوت ایک کسبی معاملہ ہوا اور ایک نیا سفر اور نبیؑ کے حصولِ علم میں کوئی فرق نہ ہوا۔

مولانا مودودی صاحب اس کا جواب دیتے ہیں۔

---

[1] سائل کو نبوت کی جگہ عقیدۂ توحید لکھنا چاہئے تھا۔

جواب : معلوم ہوتا ہے کہ نبوت کے وہبی ہونے کا مطلب نہیں سمجھا گیا اسی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوا ہے نیز آیات کے مشاہدے سے حق کی جستجو کرنا اور فلسفیانہ قیاس آرائیوں سے حقیقت تک پہونچنے کی کوشش کرنا ایک دوسرے کا ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ چیز بھی سائل کے لئے غلط فہمی کی موجب ہوئی۔

قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام وحی آنے سے پہلے جو علم رکھتے تھے اس کی نوعیت عام انسانی علوم سے کچھ بھی مختلف نہ ہوتی تھی ان کے پاس نزول وحی سے پہلے کوئی ایسا ذریعۂ علم نہ ہوتا تھا جو دوسرے لوگوں کو حاصل نہ ہو چنانچہ فرمایا ماکنت تدری ما الکتب ولا الایمان (شوریٰ ۵) تم کچھ نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے ووجدک ضالا فھدی (الضحیٰ) اور اللہ نے تم کو ناواقف راہ پایا پھر راستہ بتایا اس کے ساتھ قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام نبوت سے پہلے علم و معرفت کے انھیں عام ذرائع سے جو دوسرے انسانوں کو حاصل ہے ایمان بالغیب کی منزل طے کر چکے ہوتے تھے وحی آکر جو کچھ کرتی تھی وہ بس یہ تھا کہ پہلے جن حقیقتوں پر ان کا دل گواہی دیتا تھا اب انھیں کے متعلق وحی یقینی اور قطعی شہادت دیتی تھی کہ وہ حق ہیں اور انھیں صداقتوں کا عینی مشاہدہ کرا دیا جاتا تھا تاکہ وہ پورے وثوق سے دنیا کے سامنے ان کی گواہی دے سکیں۔ یہ مضمون سورۂ ہود میں بار بار تکرار بیان کیا گیا ہے چنانچہ پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا۔

أفمن كان على بينة من ربه ويتلوه شاهد منه ومن قبله كتاب موسى إماما ورحمة

پھر کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل روشنی پر تھا (یعنی عقلی و فطری ہدایت پر) اس کے بعد خدا کی طرف سے ایک گواہ بھی اس کے پاس آگیا (یعنی قرآن) اور اس سے پہلے موسیٰؑ کی کتاب بھی رہنما اور رحمت کے طور پر موجود تھی (کیا وہ اس صداقت کے بارے میں شک کر سکتا ہے)

(رکوع نمبر۲)

- - - - - - -

پھر اس کے بعد یہی مضمون رکوع ۳ میں حضرت نوحؑ کی زبان سے ادا ہوتا ہے

يا قوم أرأيتم إن كنت على بينة من ربي وآتاني رحمة من عنده فعميت عليكم أنلزمكموها وأنتم لها كارهون

اے میری قوم کے لوگو! غور کرو اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن پر تھا اور اس کے بعد اس نے اپنی طرف سے مجھ کو رحمت (وحی و نبوت) سے بھی نوازا اور وہ چیز تم کو نظر نہیں آتی تو اب کیا ہم زبردستی اسے تمہارے سر تھیپک دیں۔

پھر اسی مضمون کو چھٹے رکوع میں حضرت صالحؑ اور آٹھویں رکوع میں حضرت شعیبؑ دہراتے ہیں اسی سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے

ف اس جگہ جن آیتوں کے حوالے سے مولانا مودودی نے یہ نتیجہ اخذ فرمایا ہے کہ شاہد ۱۰ اور غور

(بقیہ صفحہ ۱۰۱)

کہ وحی کے ذریعہ سے حقیقت کا براہِ راست علم پانے سے پہلے انبیاء علیہم السلام مشاہدہ اور غور و فکر کی فطری قابلیتوں کو صحیح طریقے پر استعمال کر کے (جسے اوپر کی آیات میں بینۃ من ربی سے تعبیر کیا گیا ہے) توحید و معاد کی حقیقتوں تک پہونچ جاتے تھے اور ان کی یہ رسائی وہبی نہیں بلکہ کسبی ہوتی تھی اسکے بعد پھر اللہ تعالیٰ انھیں علم وحی عطا کرتا تھا اور یہ چیز

(بقیہ حاشیہ صفحہ) مشاہدہ اور غور و فکر کی فطری صلاحیتوں کو صحیح طریقہ پر استعمال کر کے انبیاء علیہم السلام توحید کی حقیقت تک وحی کی آمد سے پہلے پہونچ جاتے تھے اور ان کا یہ علم توحید کا حاصل کرنا عقلی اور استدلالی ہوتا تھا جو خود ان کے کسب کا نتیجہ تھا یہ وہبی نہیں تھا بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ متعلقہ آیتوں میں سے کسی ایک آیت کے اندر بھی کوئی ایسا کلمہ نہیں ہے جو مودودی صاحب کے اس مقصود پر دلالت کرتا ہو بلکہ بینہ کے ساتھ من ربی کا اضافہ ہر جگہ اسی بات کی صراحت کرتا ہے کہ یہ توحید کا علم ان انبیاء کرام علیہم السلام کو کسب و استدلال کے بغیر خالصۃً منجانب اللہ ہوتا تھا بلکہ یوں کہئے کہ وہبی کی دوسری تعبیر ہی من ربی ہے علاوہ بریں بینہ سے یہ بھی ضروری نہیں کہ لازماً علم توحید ہی مراد ہو بلکہ دلیل و بیان وغیرہ بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح بینہ پر رحمت کا عطف تفسیری بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ بعض مفسرین کا خیال ہے ۱۲

کبھی نہیں بلکہ وہبی ہوتی تھی (رسائل ومسائل حصہ اول صفحہ ۲۱،۲۲،۲۳)

اس جگہ سائل نے تفہیم القرآن کی جس تفسیر اور توضیحی نوٹ کا حوالہ دیا ہے اس کو ناظرین کے سامنے پیش کر دینا ضروری ہے متعلقہ آیت کی تفسیر میں مولانا مودودی صاحب تفہیم القرآن کے اندر تحریر فرماتے ہیں۔

یہاں حضرت ابراہیمؑ کے اس ابتدائی تفکر کی کیفیت بیان کی گئی ہے جو منصب نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے ان کے لئے حقیقت تک پہونچنے کا ذریعہ بنا اس پر بتایا گیا ہے ایک صحیح الدماغ اور سلیم النظر انسان جس نے سراسر شرک کے ماحول میں آنکھیں کھولیں تھیں اور جسے توحید کی تعلیم کہیں سے حاصل نہ ہوسکتی تھی کس طرح آثار کائنات کا مشاہدہ کرکے اور ان پر غور وفکر اور ان سے صحیح استدلال کرکے امر حق معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا اوپر قوم ابراہیم کے جو حالات بیان کئے گئے ہیں ان پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب ہوش سنبھالا تھا تو ان کے گرد وپیش ہر طرف چاند سورج اور تاروں کی خداوندی کے ڈنکے بج رہے تھے اسی لئے قدرتی طور پر حضرت ابراہیمؑ کی حقیقت کی جستجو کا آغاز اسی سوال سے ہونا چاہئے تھا کہ کیا فی الواقع ان میں سے کوئی رب ہوسکتا ہے اسی مرکزی سوال پر انھوں نے غور وفکر کیا اور آخر کار اپنی قوم کے سارے خداؤں کو ایک اٹل قانون کے تحت غلاموں کی طرح گردش کرتے دیکھ کر

وہ اس نتیجہ پر پہونچ گئے کہ جن جن کے رب ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے ان میں سے کسی کے اندر الوہیت کا شائبہ تک نہیں ہے رب صرف وہی ایک ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے اور بندگی پر مجبور کیا۔

اس قصہ کے الفاظ سے عام طور پر لوگوں کے ذہن میں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے یہ جو ارشاد ہوا کہ جب رات طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا اور جب وہ ڈوب گیا تو یہ کہا پھر دیکھا چاند کو اور جب وہ ڈوب گیا تو یہ کہا اور پھر دیکھا سورج کو اور جب وہ بھی ڈوب گیا تو یہ کہا اس پر ایک عام ناظر کے ذہن میں فوراً یہ سوال کھٹکتا ہے کہ کیا بچپن سے آنکھ کھولتے ہی روزانہ حضرت ابراہیمؑ پر رات طاری نہ ہوتی تھی اور کیا وہ ہر روز چاند، تاروں اور سورج کو طلوع و غروب ہوتے نہ دیکھتے تھے؟ ظاہر بات ہے کہ غور و فکر تو انھوں نے سنِ رشد کو پہونچنے کے بعد ہی کیا ہوگا۔ پھر یہ قصہ اس طرح کیوں بیان کیا گیا ہے کہ جب رات ہوئی تو یہ دیکھا اور دن نکلا تو یہ دیکھا گویا کہ خاص واقعہ سے پہلے انھیں یہ چیزیں دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا حالانکہ ایسا ہونا صریحاً مستبعد ہے۔

یہ شبہ بعض لوگوں کے لئے اس قدر ناقابلِ حل بن گیا کہ اسے دفع کرنے کی کوئی صورت انھیں اس کے سوا نظر نہ آئی کہ حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش اور پرورش ایک غار میں ہوئی تھی جہاں سنِ رشد کو پہونچنے تک وہ چاند، تاروں اور سورج کے مشاہدہ سے محروم رکھے گئے تھے۔

حالانکہ یہ بات بالکل صاف ہے اور اس کو سمجھنے کے لئے اس نوعیت کی کسی داستان کی ضرورت نہیں ہے۔ نیوٹن کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے باغ میں ایک سیب کو درخت سے گرتے دیکھا اور اس سے اس کا ذہن اچانک اس سوال کی طرف متوجہ ہوگیا کہ اشیاء آخر زمین ہی پر کیوں گرا کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ غور کرتے کرتے قانون جذب وکشش کے استنباط تک پہونچ گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس واقعہ سے پہلے نیوٹن نے کبھی کوئی چیز زمین پر گرتے نہیں دیکھی تھی؟ ظاہر ہے کہ ضرور دیکھی ہوگی اور بار بار دیکھی ہوگی پھر کیا وجہ ہے کہ وہ اس تاریخ کو سیب گرنے کے مشاہدے سے نیوٹن کے ذہن میں وہ حرکت پیدا ہوئی جو اس سے پہلے روزمرہ کے ایسے سیکڑوں مشاہدات سے نہ ہوئی تھی۔

اس کا جواب اگر کچھ ہوسکتا ہے تو یہی ہوسکتا ہے کہ غور وفکر کرنے والا ذہن ہمیشہ ایک طرح کے مشاہدات سے ایک ہی طرح متاثر نہیں ہوا کرتا۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک چیز کو ہمیشہ دیکھتا رہتا ہے اور اس کے ذہن پر کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی مگر ایک وقت اسی چیز کو دیکھ کر یکایک ذہن میں ایک کھٹک پیدا ہوجاتی ہے جس سے فکر کی قوتیں ایک خاص مضمون کی طرف کام کرنے لگتی ہیں یا پہلے سے کسی سوال کی تحقیق میں ذہن الجھا رہتا ہے اور یکایک روزمرہ کے ہی مشاہدات میں سے کسی ایک چیز پر نظر پڑتے ہی گتھی کا دو!

سرا ہاتھ لگ جاتا ہے جس سے ساری الجھنیں چلی جاتی ہیں۔

ایسا ہی معاملہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ بھی پیش آیا۔ راتیں روز آتی تھیں اور گزر جاتی تھیں سورج اور چاند اور تارے سبھی آنکھوں کے سامنے ڈوبتے اور ابھرتے رہتے تھے لیکن وہ ایک خاص دن تھا جب ایک تارے کے مشاہدے نے ان کے ذہن کو اس راہ پر ڈال دیا جس سے بالآخر توحید الٰہ کی مرکزی حقیقت تک پہونچ رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا ذہن پہلے سے اس سوال پر غور کر رہا ہو کہ جن عقائد پر ساری قوم کا نظام زندگی چل رہا ہے ان میں کس حد تک صداقت ہے اور پھر ایک تارا یکایک سامنے آکر کشود کار کیلئے کلید بن گیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تارے کے مشاہدے سے ہی ذہنی حرکت کی ابتدا ہوئی ہو اس سلسلہ میں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جب ابراہیمؑ نے تارے کو دیکھکر کہا یہ میرا رب ہے اور جب چاند سورج کو دیکھکر انھیں اپنا رب کہا تو کیا اس وقت عارضی طور پر ہی سہی وہ شرک میں مبتلا نہ ہوگئے تھے اس کا جواب یہ ہے۔

کہ طالب حق اپنی جستجو کی راہ میں سفر کرتے ہوئے جن منزلوں پر غور و فکر کے لئے ٹھہرتا ہے اصل اعتبار ان منزلوں کا نہیں ہوتا بلکہ اصل اعتبار اس سمت کا ہوتا ہے جس پر وہ پیش قدمی کر رہا ہے اور اس آخری مقام کا ہوتا ہے جہاں پہونچکر وہ قیام کرتا ہے۔ بیچ کی منزلیں ہر جویائے حق کے

لئے ناگزیر ہیں ان پر ٹھہرنا بسلسلۂ طلب و جستجو ہوتا ہے نہ کہ بصورتِ فیصلہ اصلاً یہ ٹھہراؤ سوالی اور استفہامی ہوا کرتا ہے نہ کہ حکمی۔ طالب جب ان میں سے کسی منزل پر رک کر کہتا ہے کہ "ایسا ہے" تو درا صل یہ اس کی آخری رائے نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسا ہے؟ اور تحقیق سے اس کا جواب نفی میں پاکر وہ آگے بڑھ جاتا ہے اس لئے یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ اثنائے راہ میں جہاں جہاں وہ ٹھہرتا رہا وہاں وہ عارضی طور پر کفر و شرک میں مبتلا رہا (تفہیم القرآن جلد اول ص ۵۵۶ تا ۵۵۹)

مودودی صاحب کے اس طویل بیان میں تین کھلی تصریح ہے۔

۱۔ یہ کہ انبیاء علیہم السلام وحی آنے سے پہلے جو علم رکھتے تھے اس کی نوعیت عام انسانی علوم سے کچھ بھی مختلف نہ ہوتی تھی ان کے پاس نزولِ وحی سے پہلے کوئی ایسا ذریعۂ علم نہ ہوتا تھا جو دوسرے لوگوں کو حاصل نہ ہو۔

۲۔ یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس واقعہ سے پہلے پہلے موحد نہیں تھے یعنی انھیں اس کے پہلے توحید کا علم حاصل نہ تھا اس واقعہ کے ذریعے انھوں نے استدلالی طریقے پر علم توحید حاصل کیا اور موحد ہوئے۔

۳۔ یہ کہ مذکورہ واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ زمانۂ نبوت سے پہلے پہلے سنِ رشد کو پہونچنے کے بعد پیش آیا ہے۔

ہم ترتیب وار مودودی صاحب کے ان تحقیقات پر علمی تنقید و تبصرہ ناظرین

لے چودھواں ایڈیشن مکتبہ تعمیر انسانیت، اندرون موچی دروازہ لاہور

کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں اور اس سے فارغ ہونے کے بعد ہم اس مغالطے کی حقیقت بھی واضح کریں گے جس کے ذریعہ مودودی صاحب نے اپنے آخری جملوں میں کام نکالنے کی کوشش کی ہے ۔

مودودی صاحب کی پہلی تحقیق اور اس پر تنقید و تبصرہ

مودودی صاحب کا یہ عقیدہ کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے پاس نبوت سے پہلے علم کا کوئی مخصوص ذریعہ نہیں ہوتا لہذا وہ کسی چیز کا علم صرف انھیں ذرائع سے حاصل کرتے تھے جو عام لوگوں کو حاصل ہے بالخصوص حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ان کا یہ خیال کہ سن رشد کے بعد ان کو توحید کا علم حاصل ہوا اور اس وقت ان کو اپنی قوم کی گمراہی اور کواکب کے باطل ہونے کا یقین حاصل ہوا ورنہ اس واقعہ کے پہلے وہ تو سرے سے ان باتوں پر یقین ہی نہ رکھتے تھے یا کم از کم متحیر اور متردد تھے کوئی فیصلہ نہیں کر پائے تھے یہ عقیدہ مودودی صاحب کی خط کشیدہ سطروں اور رسائل و مسائل سے منقول سوال و جواب کی عبارت سے اس قدر واضح ہے کہ اس پر مزید روشنی ڈالنے اور اس کی تشریح و توضیح کرنے کی قطعاً کوئی حاجت نہیں لہذا اس سلسلہ میں مودودی صاحب نے رسائل و مسائل کے اندر جن دو آیتوں کو بطور دلیل استعمال فرمایا ہے ان کی اصل حقیقت کیا ہے اکابرین اہل سنت اور معتمد علیہ مفسرین کی زبان سے نقل کر دینا ضروری ہے علامہ آلوسی علیہ الرحمہ آیت

وما كنت تدري ما الكتاب ولا الایمان کے تحت لکھتے ہیں۔

واشکلت الآیة بان ظاهرها	آیت پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ ظاہر اس بات
یستدعی عدم الاتصاف بالایمان	کی مقتضی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو نبوت سے
قبل الوحی ولا یصح ذالک لان	پہلے ایمان ہی حاصل نہ ہو حالانکہ یہ کسی طرح
الانبیاء علیہم الصلوٰة والسلام	درست نہیں کیونکہ جملہ انبیاء کرام علیہم السلام قبل
جمیعاً قبل البعثة مؤمنون	نبوت بھی صاحب ایمان ہوتے ہیں اس لئے کہ
لعصمتهم عن الکفر باجماع	وہ کفر سے معصوم ہوتے ہیں اس پر تمام
من یعتد به واجیب بعدة اجوبة	معتمد لوگوں کا اجماع ہو چکا ہے۔ رہا اعتراض
(روح المعانی صفحہ ۵۰ / ۲۵)	تو اس کا جواب چند طریقہ سے دیا گیا ہے۔

مزید جوابوں کی تفصیل کے لئے تفسیر کی کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہئے ہم اس جگہ صرف ان جوابوں پر اکتفا کرتے ہیں جن کا علامہ آلوسی علیہ الرحمۃ نے ذکر فرمایا ہے۔

۱۔ الاول ان الایمان هنا	پہلا جواب یہ ہے کہ ایمان سے اس جگہ صرف
لیس المراد به التصدیق المجرد	تصدیق مراد نہیں ہے بلکہ تصدیق قلبی اقرار
بل مجموع التصدیق والاقرار	لسانی اور اعمال تینوں کا مجموعہ
والاعمال (روح المعانی صفحہ ۵۰ / ۲۵)	مراد ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ آپ وحی سے پہلے اس مجموعہ کا علم نہیں رکھتے تھے ظاہر ہے

کہ مجموعہ اور کل کے علم کی نفی سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ ان میں سے کسی ایک چیز کا بھی علم نہ رکھتے ہوں۔ تصدیق کا علم تو قبل وحی بھی حاصل تھا لیکن مجموعہ کا علم نہیں تھا اس لئے مجموعہ کے علم کی نفی درست ہوسکتی ہے اور ایمان کا لفظ تینوں کے مجموعہ پر اس جگہ بالکل اسی طرح بولا گیا ہے جیسا کہ آیت ما کان اللہ لیضیع ایمانکم کے اندر ایمان کا اطلاق امور ثلثہ کے مجموعہ پر ہوا ہے۔

۲۔ الثانی ان الایمان انما یعنی التصدیق باللہ تعالیٰ و برسولہ علیہ السلام — دوسرا جواب یہ ہے کہ ایمان سے تصدیق باللہ اور تصدیق بالرسول کا مجموعہ مراد لیا جائے۔

اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبل نبوت خود اپنی رسالت پر ایمان لانے کی کیفیت و تفصیل سے بے خبر تھے جب منصب رسالت پر فائز ہوئے تو یہ ضروری ہوا کہ سب سے پہلے خود اپنی رسالت پر آپ ایمان لادیں اس لئے آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ آپ ایمان کو نہیں جانتے تھے یعنی توحید کے ساتھ خود اپنی رسالت پر ایمان لانے کی حقیقت کو آپ نہیں جانتے تھے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پہلے آپ توحید ہی کا علم نہ رکھتے ہوں۔

۳۔ الثالث ان المراد شرائع الایمان ومعالمہٗ — تیسرا جواب یہ ہے کہ ایمان سے مراد شعائر و احکام اور شریعت کے ارکان ہیں۔

مطلب یہ ہوا کہ آپ نماز روزہ حج وزکوٰۃ وغیرہ کی تفصیل اور ان ارکان شریعت سے بے خبر تھے وحی کے ذریعہ ان امور کا علم آپ کو عطا کیا گیا لہٰذا ایمان سے مراد اس جگہ ارکان شرع اور احکام تکلیفی ہیں ان کے نہ جاننے سے یہ لازم نہیں آتا کہ نفس توحید سے بھی آپ بے خبر ہوں۔

الرابع ان الکلام	چوتھا جواب یہ ہے کہ اس جگہ مضاف محذوف ہے
علیٰ تقدیر مضاف فقیل التقدیر	گویا اصل میں دعوۃ الایمان ہے ...
دعوۃ الایمان	یعنی آپ اس بات سے بے خبر تھے) کہ لوگوں
کیف تدعو الخلق الی الایمان	کو ایمان کی طرف کس طرح دعوت دیں

اس جواب کا حاصل یہ ہوا کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کو وحی کے پہلے یہ بات معلوم نہ تھی کہ ایمان کی طرف لوگوں کو کس طرح بلایا جائے اور تبلیغ کس طریقہ پر شروع کی جائے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ توحید سے ہی آپ بے خبر ہوں طریقۂ کار کے نہ جاننے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ نفس کام سے ہی آدمی بے خبر ہو۔

یہی جوابات اس آیت کے صحیح مفہوم کی وضاحت کرنے کے لئے بھی بہت کافی ہیں جس کو مودودی صاحب نے اپنے استدلال میں دوسرے نمبر پر ... ر فرمایا ہے وہ یہ ہے "ووجدک ضالاً فھدیٰ" (والضحیٰ) اور اللہ نے تمہیں ناواقف راہ پایا پھر تمہیں راستہ بتایا۔ یعنی ناواقف راہ سے مراد توحید سے ناواقف ...

نہیں ہے جیسا کہ مودودی صاحب یقین کرانا چاہتے ہیں بلکہ گزشتہ جوابات میں جن باتوں سے بے خبر ہونا بتایا گیا ہے انھیں سے ناواقف ہونا مراد ہے مزید اطمینان کے لئے اس آیت کے تحت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحؒ نے جو کچھ فرمایا ہے اس کو نقل کرنا فائدے سے خالی نہ ہوگا تاکہ یہ بات بھی معلوم ہو جائے کہ مفسرین نے جو توجیہات اس جگہ پیش کی ہیں ان سب کی بنیاد کتاب وسنت ہی پر ہے چنانچہ شاہ صاحب اپنی تحریر میں اس مقام پر ایک حدیث بھی نقل فرماتے ہیں۔

درینجا ایں قدر بالیقین باید دانست کہ انبیاء قبل از بعثت نیز از ضلال وکفر اصلی وطبعی معصوم ومحفوظ اند بلکہ از معاصی نیز چنانچہ در حدیث شریف است کہ من ہیچگاہ قصد نہ کردہ ام کہ کارے از آں کارہا کہ اہل جاہلیت میکردند بعمل آرم۔ مگر دوبار ودر ہر دو بار بلطف الٰہی آں کار کردن نہ دو عصمت او تعالیٰ درمیان من ودرمیان آں کار حائل شد وایں دو کار اینست کہ روزے من بجو انے را از قریش کہ ہمراہ من

اس جگہ اتنی بات تو قطعی طریقہ پر جان لینا چاہیئے کہ انبیاء کرام نبوت سے پہلے بھی گمراہی یا اصلی وطبعی کفر سے بلکہ قصداً گناہوں سے معصوم ومحفوظ ہوتے ہیں حدیث شریف میں ہے کہ میں نے کبھی یہ ارادہ نہیں کیا کہ ان کاموں میں سے کوئی کام کروں جو اہل جاہلیت کیا کرتے تھے مگر دو مرتبہ اور ان دونوں مرتبہ بھی عنایت خداوندی سے وہ کام کرنے نہ پایا خدا تعالیٰ کی عصمت میرے درمیان اور اس کام کے درمیان حائل ہو گئی وہ دو کام یہ ہیں

بزان و گوسفندان را بیرون مکہ
می چرانید گفتم کہ امشب از گوسفندان
و بزان من خبردار باشی تا در شہر
مکہ بروم و در آن جا چند جوانان
نشستہ افسانہ می گویند من
ہم آن افسانہ را بشنوم چون بہ
این قصد در مکہ داخل شدم در
اول خانہ کہ در راہ من افتاد
آواز مزامیر و طبل و دیگر ملاہی
شنیدم گفتم چیست گفتند فلان
کس را بہ فلان زن امروز
شادی شدہ و من ہم در آن خانہ
در آمدم و خواستم کہ آن تماشہ
ببینم ۔ ہمین کہ نشستم خواب
را بر من بہ آنجا مسلط کردند کہ
تا طلوع آفتاب بیدار نشدم

کہ ایک دن قریش کے ایک نوجوان کو جو میرے
ساتھ مکہ کے باہر بکریاں چرایا کرتا تھا
اس سے میں نے کہا کہ آج کی رات میرے بھیڑ
بکریوں کی دیکھ بھال کر دینا تاکہ میں شہر مکہ کے
اندر جاؤں وہاں کچھ نوجوان بیٹھے افسانہ گوئی
کر رہے ہیں اس افسانہ کو میں بھی سن لوں
جب اس ارادہ کے ساتھ مکہ میں داخل ہوا
تو سب سے پہلا مکان جو میرے راستے میں
پڑا اس کے اندر سے ڈھول باجے اور دوسرے
تماشوں کی مجھے آواز ملی میں نے لوگوں سے
دریافت کیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے لوگوں نے
بتایا کہ فلاں شخص کی فلاں عورت سے آج
شادی ہونے والی ہے میں بھی اس گھر میں
چلا گیا تاکہ تماشہ دیکھ سکوں ابھی بیٹھا ہی
تھا کہ مجھ پر اس طرح نیند مسلط کر دی
گئی کہ آفتاب طلوع ہونے تک جاگ نہیں
سکا جس وقت میں بیدار ہوا مجلس ختم ہو چکی

ل۔ اس حدیث کو باختصار شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی رح نے مدارج النبوۃ جلد اول میں نقل فرمایا ہے

بعد ازاں کہ بیدار شدم مجلس برخاستہ بود
ہمیں قسم بار دگر نیز قصد کردم درخواب
درمیان من و درمیان شنیدن افسانہ
وسماعِ مزامیر حائل گشت و بعصمتِ او
تعالیٰ محفوظ ماندم و ازاں بعد ہرگز خیالِ
بد پیرامونِ خاطر من نگشت تا آنکہ حق تعالیٰ
مرا برسالتِ خود نواخت و آں عصمت را
دوبالا ساخت لیکن دانستن شرائع و تفحص
بدریافت آنہا انبیاء را قبل از بعثت نیز
می باشد۔ در تلاشِ راہِ حق می
شوند و ایں قدر برائے استعمال
لفظ ضلال کافی است چنانکہ
گذشت۔

(تفسیر عزیزی پارہ عم صفحہ ۲۲۱، ۲۲۲)

ختم ہو چکی تھی اسی طرح دوسری مرتبہ ارادہ کیا مگر نیند
میرے درمیان اور باجوں اور افسانوں کے
سننے کے درمیان حائل ہو گئی اور خداوند
تعالیٰ کی عصمت[1] کے سبب میں محفوظ رہا
پھر اس کے بعد کبھی کوئی غلط خیال میرے دل میں پیدا نہیں
ہوا یہاں تک کہ خداوند تعالیٰ نے مجھے رسالت
سے نواز دیا اور اس عصمت کو دوبالا کر دیا
(شاہ صاحب فرماتے ہیں) لیکن احکام شرع
کی دانست اور ان کے دریافت کرنے کی تشنگی
نبوت سے پہلے بھی انبیاء کرام علیہم السلام کو
ہوتی ہے اور وہ اس حق کے راستہ کی جستجو میں
میں لگے رہتے ہیں اور یہی بات لفظ ضلال
کے استعمال کے لئے بہت کافی ہے۔ جیسا کہ
پہلے گذر چکا ہے۔

---

[1] اس سے معلوم ہوا کہ عصمت و حفاظت انبیاء کرام علیہم السلام کے حق میں مترادف و ہم معنیٰ ہیں [2] اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد بحوالہ ابن حجر ترجمان السنہ صفحہ ۲۷۱ ۲۲۰ پر رجالہ ثقات لکھا ہے

انبیاء کرام کا قبل نبوت ملہم و معصوم ہونا قرآن و حدیث سے ثابت ہے

جس طرح شاہ عبدالعزیز رح کی پیش کردہ حدیث سے زمانۂ نبوت کے قبل ہی سے آنحضر صلی اللہ علیہ وسلم کا معصوم ہونا ثابت ہوتا ہے بالکل اسی طرح بعض احادیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ قبل نبوت سے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خداوند تعالیٰ کی عبادت کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی وحدانیت کا عقیدہ رکھے بغیر اس کی عبادت کا آپ کے بارے میں تصور کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ بریں حقیقت یہ ہے کہ توحید کا انبیاء علیہم السلام کو وہبی طور پر ولادت کے وقت سے حاصل ہوتا ہے اور آگے چلکر ان کا انفس و آفاق میں غور کرنا یا کائنات و عجائبات قدرت سے ان کا استدلال کرنا اضافۂ یقین یا الزام خصم کی غرض سے ہوتا ہے نہ کہ حصول علم کی غرض سے جیسا کہ اس مسئلہ پر آئندہ صفحات میں پوری طرح روشنی ڈالی جائے گی اور اس وقت اس کے دلائل بھی ذکر کئے جائیں گے اس جگہ تو یہ بتانا مقصود تھا کہ مودودی صاحب نے جس آیت کو اپنے عقیدہ کی دلیل کے طور پر پیش فرمایا تھا اس کا صحیح مطلب کیا ہے اور اکابر اہلسنت سیر و تفسیر کی کتابوں میں اس کے متعلق کیا تحریر فرماتے ہیں جیسا کہ بالاختصار بیان بھی کیا گیا مزید تفصیلی معلومات کے لئے متعلقہ آیت کی تفسیروں کا مطالعہ کرنا چاہئے بہر حال اس جگہ ناظرین کو مودودی صاحب کی کم فہمی اور کج علمی کا

کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہو گیا ہوگا اور یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی ہوگی کہ مودودی صاحب کا یہ خیال کہ توحید کا علم حاصل کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام کے پاس قبل نبوت عام انسانی ذرائع کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہوتا اور ہر چیز کا علم حتی کہ توحید کا علم بھی وہ انھیں عام ذرائع سے حاصل کرتے ہیں جو تمام انسانوں کو میسر ہیں خالص غیر اسلامی عقیدہ ہے جس کے لئے دین میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی کیونکہ زمانہ نبوت کے پہلے سے ہی انبیاء کرام علیہم السلام کا خداوند تعالیٰ کی مخصوص نگرانی میں ہونا اور قدرت خداوندی کا ان کی نشوونما سے لیکر اعمال وعقائد کی اصلاح و درستگی تک کیلئے خصوصی اہتمام کرنا قرآن و سنت کا سطحی مطالعہ رکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں ہے بالخصوص علم عقائد میں یہ امر تو بالکل بدیہی ہے جس کی بے شمار محققین نے تصریح کی ہے جیسا کہ اپنے موقعہ پر حوالے بھی نقل کئے جائیں گے اور خود قرآن حکیم سے بھی واضح ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات قرآن پاک میں مختلف جگہوں پر جس کثرت کیساتھ بیان کئے گئے ہیں بالخصوص زمانۂ نبوت سے پہلے ان کی ولادت وطفولیت اور پرورش کے واقعات اللہ تعالیٰ نے جتنی تفصیل اور تکرار کے ساتھ ذکر کئے ہیں شاید کسی دوسرے پیغمبر کے حالات کا ذکر قرآن میں اتنی کثرت سے نہیں کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ ؑ کے ان احوال کے ذریعہ قرآن کا مطالعہ کرنے والا ہر کسی تامل کے یہ سمجھ سکتا ہے کہ زمانۂ طفولیت میں بھی خداوند تعالیٰ نے اپنی خاص حفاظت

ونگرانی سے ایک لمحہ کے لئے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو محروم نہیں فرمایا ورنہ ان کی زندگی جن خطرات اور بھیانک صورتِ حال سے دو چار تھی اس میں حیات کا کوئی ظاہری امکان نہ تھا اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

ولتصنع علیٰ عینی — اور یہ سب کچھ اس لئے کیا تاکہ تیری پرورش میری نگاہ کے سامنے کی جائے۔

معلوم ہوا کہ انبیا کرام علیہم السلام زمانہ طفولیت سے لیکر شباب و بلوغ کی منزل تک بلکہ قبل نبوت اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں عام لوگوں سے ضرور امتیاز رکھتے ہیں بایں معنیٰ کہ قدرت اپنی عادتِ عامہ کے علاوہ خاص طور پر ان کی حفاظت ونگرانی کرتی ہے اور ان کے اعمال وعقائد کے استوار کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہتی ہے۔ علم وعمل کی راہ سے جو چیز بھی ان کے لئے مضرت رساں اور نقصان کا سبب بن سکتی ہے ایسی تمام چیزوں سے ان کو کلی طور پر محفوظ رکھا جاتا ہے پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ انسانی ہدایت کے لئے جو سب سے بنیادی اور اولین عقیدۂ توحید ہے فطرت اسی سے ان کو محروم رہنے دے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

وآتیناہ الحکم صبیاً — ہم نے انکو بچپن کی زندگی ہی میں حکم عطا کردیا۔

اس جگہ حکم سے مراد فہم وفراست ہو یا نبوت ورسالت کچھ بھی مراد ہو سب سے پہلی اور بنیادی چیز علم توحید ہے جس کے بغیر نہ کوئی فہم وفراست خداوند

تعالیٰ کی نگاہ میں حکم سے تعبیر کئے جانے کی مستحق ہو سکتی نہ رسالت و نبوت ہی اس عقیدے کے بغیر معتبر ہو سکتی ہے پس اس آیت سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے پاس زمانۂ نبوت کے بہت پہلے طفولیت کے وقت ہی سے حصولِ علم کا ایک ایسا مخفی ذریعہ ہوتا ہے جو دوسرے انسانوں کو حاصل نہیں ہوتا۔ بخاری کی سب سے پہلی حدیث اس بات میں صریح ہے کہ وحی کی آمد سے بہت پہلے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر الہام والقاء اور مبشرات و منامات صادقہ کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا جو اس بات کا واضح ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ وحی کی آمد سے پہلے بھی انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیم و تربیت کا کوئی ایسا ذریعہ ضرور موجود ہوتا ہے جو عام انسانی ذرائع کے علاوہ ہے شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں ۔

قضاء الٰہی نازل شود از فوق سبع سمٰوات
بہ ملاءِ اعلیٰ ۔ و ملاءِ اعلیٰ ہمہ بآں رنگ
رنگین شوند و سیل برکات ملاءِ اعلیٰ
بریں نفسِ قدسیہ فرود ریزد و ملاءِ اعلیٰ
برائے ایں نفس بصور مناسبہ متمثل شوند
و علوم شرعیہ و احسانیہ وغیرہا
در ایں نفس اندازند و ایں نفس

خدائی حکم سات آسمانوں کے اوپر سے
ملاءِ اعلیٰ میں نازل ہوتا ہے۔ ملاءِ اعلیٰ مکمل اسی
رنگ میں رنگین ہو جاتا ہے اور ملاءِ اعلیٰ کے
برکات کا سیل رواں اس نفس قدسی (یعنی ہونے
والے پیغمبر) پر اترتا رہتا ہے پھر فرشتے
مناسب شکلوں میں اس نفس قدسی کے لئے
متمثل ہوتے ہیں اور شرعی احسانی علوم اس

قدسیہ تدبیر مجرد کہ از فوق سبع سموٰت	نفسِ قدسی کے اندر ڈالتے رہتے ہیں اور
نازل شدہ در سدرۃ المنتہیٰ باحکام مثالیہ	یہ نفسِ قدسی محض اس تدبیر کے ذریعہ مطلع
ملبس گشتہ در ملاءِ اعلیٰ شائع	ہو جاتا ہے جو آسمانوں سے نزول کر کے
شد۔ در زمین فرود آمدہ است	سدرۃ المنتہیٰ میں احکام مثالیہ کا جامہ
مطلع شود و بوحی متلو یا غیر متلو	پہن کر ملاءِ اعلیٰ کے اندر ظاہر ہوتے ہوئے
کہ از عالم مجرد بمتابعتِ این ارادہ	زمین پر آچکی ہے پھر وحی متلو یا غیر متلو
نزول فرمود لباسِ مناسب	جو اس ارادۂ الٰہی کے ہمراہ عالم مجرد سے
ملاءِ اعلیٰ پوشیدہ بار دیگر لباس	آتی ہے اور ملاءِ اعلیٰ کے مناسب لباس میں
الفاظ و حروف شہادی در برکردہ	متمثل ہو کر دوبارہ ظاہری الفاظ و حروف
بر قلب این پیغامبر نزول فرماید	کا جامہ زیب تن کرنے کے بعد اس پیغمبر کے
درین وقت در لسانِ شرع	قلب پر نازل ہوتی ہے اور اس وقت
گفتہ شود بعث اللّٰہ	شریعت کی زبان سے اعلان کیا جاتا ہے
فلانا نبیاً و امرہ	کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں شخص کو نبی بنایا اور
بتبلیغ الاحکام و	اس کو احکام کی تبلیغ پر مامور کر دیا ہے اور
اوحی الیہ (ازالۃ الخفاء ج ۱ صفحہ ۵)	اس پر وحی اتاری ہے۔

دین کی معمولی بصیرت رکھنے والوں کو بھی یہ چیز معلوم ہے کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد ابتدائے آفرینش میں ہی عالم ارواح کے اندر قیامت تک

ہونے والی اولادِ آدم سے اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کا عہد و میثاق لیا تھا
یہ معاہدہ خداوند تعالیٰ کی وحدانیت و ربوبیت سے متعلق ساری نسلِ آدم
سے روزِ ازل ہی لے لیا گیا ہے جو عہد الست کے نام سے معروف و مشہور ہے
اس عام معاہدے کے علاوہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے ایک دوسرا
مخصوص میثاق بھی روزِ ازل ہی لیا گیا ہے جس کا ذکر قرآن و حدیث میں
پوری صراحت سے موجود ہے۔ عالم ارواح کا یہ میثاق اس بات کی واضح دلیل
ہے کہ توحید کا علم انسان کی اصل فطرت میں داخل ہے رہی یہ بات کہ
دنیا میں آنے کے بعد عالم ارواح کے اس عہد کو چونکہ انسان بھول جاتا ہے
اور یہ میثاق انسان کے دل و دماغ سے بالکل نسیاً منسیاً ہو جاتا ہے یہی
وجہ ہے کہ اس دنیا میں شرعاً اس پر کوئی حکم یا مواخذہ مرتب نہیں ہوتا لیکن یہ
بات اس جگہ یاد رکھنی چاہیے کہ عہد الست کا بھول جانا اور عالم اجسام
میں آنے کے بعد اسکا انسان کے قلب و دماغ سے کلی طور پر محو ہو جانا عام انسانوں
کے لیے تو اپنی جگہ درست ہے مگر انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے حق
میں یہ بات کسی طرح قابلِ تسلیم نہیں۔ اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام کی آمد
کا مقصودِ اعظم اسی عہدِ الست کو یاد دلانا ہوتا ہے پھر اگر وہ خود ہی میثاق
الست کو بھول چکے ہوں تو دوسرے کو کیونکر یاد دلا سکتے ہیں اور یہی وجہ
ہے کہ میثاق عام کے علاوہ ایک دوسرا مخصوص معاہدہ بھی انبیاء کرام علیہم

الصلوٰۃ والسلام سے اس روز لیا گیا تاکہ میثاق اول کی تائید اور اس کا استحضار باقی رہ سکے۔ یہ بات کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اس دنیا میں عہد الست کی یاد دہانی کے لئے تشریف لاتے ہیں اور یہ میثاق عالم اجساد میں آنے کے بعد بھی انھیں مستحضر اور محفوظ رہتا ہے اس کا ذکر حدیث اور بعض علما کے اقوال میں پایا جاتا ہے چنانچہ مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر کی آخری فصل میں ایک روایت کے اندر موجود ہے۔

واعلموا انہ لا الٰہ غیری ولا رب غیری ولا تشرکوا بی شیئًا انی سارسل الیکم رسلی یذکرونکم عہدی میثاقی (مشکوٰۃ صفحہ ۲۳)

یہ ذہن نشین کرو میرے سوا کوئی معبود نہیں اور میرے علاوہ کوئی رب ہے اور میرا شریک کسی چیز کو نہ ٹھہرانا میں تمہارے پاس اپنے رسولوں کو بھیجوں گا جو میرے عہد و میثاق کی تمہیں یاد دہانی کرائیں گے۔

تفسیر مظہری میں ہے۔

ان الانبیاء لم تحجب ارواحہم بدخولہا فی الاشباح عن التوحید الاصلی الذی کان لہم فی یوم الست بربکم بل بعض الاولیاء کذالک (مظہری صفحہ ۲۵۴)

بلاشبہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ارواح ان کے اجسام میں آنے کے بعد بھی اصلی توحید سے غافل نہیں ہوتے جو حاصل ہو چکی تھی یوم الست میں بلکہ یہی حال بعض اولیاء کا بھی ہے۔

چونکہ وحی کی آمد اور بعثت کے پہلے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام تبلیغ پر مامور نہیں ہوتے اس لئے توحید کی اعلانیہ اشاعت و تبلیغ زمانۂ نبوت کے پہلے وہ شروع نہیں کرتے لیکن اتنی بات بدیہی ہے کہ اپنی ذات کی حد تک عبادت کا وہ پوری طرح لحاظ رکھتے ہیں اور یہ میثاق ہمہ وقت ان کے پیش نظر رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ زمانۂ نبوت کے پہلے بھی ایک لمحہ کیلئے شرک کی گندگی سے آلودہ نہیں ہو پاتے بہر حال یہ حقیقت آفتاب نیم روز سے بھی زیادہ روشن ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو قبل نبوت بھی علم کا ایک مخفی ذریعہ حاصل ہوتا ہے اسی طرح توحید کا علم بھی ان کی فطرت میں داخل ہوتا ہے۔ علامہ آلوسی علیہ الرحمۃ تحریر فرماتے ہیں۔

انہ علیہ السلام لم یزل
موحیً الیہ و انہ علیہ السلام
متعبد بما یوحیٰ الیہ الَّا ان
الوحی السابق علی البعثۃ
کان القاءً ونفثاً فی الروع
وما عمل بما کان من شرائع
ابیہ علیہما الصلوٰۃ والسلام
الا بواسطۃ ذالک الالقاء

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (نبوت کے پہلے بھی)
ہمیشہ مہبط وحی رہے ہیں اور آپؐ نے
(اس زمانے میں) اسی طریقے پر عبادت کی
ہے جو وحی کے ذریعہ آپؐ کو بتایا گیا تھا
لیکن یہ قبل نبوت کی وحی القاءِ قلب اور الہام
کے طور پر ہوئی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
اپنے جد اعلیٰ (حضرت ابراہیم علیہما الصلوٰۃ
والسلام کی شریعت پر عمل نہیں کرتے تھے

وإذا كان بعض أخوانه عليه السلام قد أوتي الحكم صبيا ابن سنتين أو ثلاث فهو عليه الصلوة والسلام أولى بأن يوحى إليه ذالك النوع من الإيحاء صبيا أيضا (روح المعانی صفحہ ۲۵۷)

مگر اسی القاء و الہام کے واسطے سے اور جب کہ آپ کے بعض بھائیوں (یعنی انبیاء کرام علیہم السلام مثلاً حضرت یحییٰ علیہ السلام) کو دو سال یا تین سال کی عمر ہی میں حکم عطا کر دیا گیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بدرجۂ اولیٰ اس بات کے مستحق ہیں کہ اس قسم کی وحی آپ کے لئے بھی ثابت ہو

گزشتہ آیت ماکنت تدری ما الکتاب ولا الایمان کی تفسیر کرتے ہوئے قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں۔

وهذا التفسير مبني على اتفاق أهل العلم على أن الأنبياء عليهم الصلوة والسلام كانوا ملهمين من الله تعالى بالإيمان بالصانع المتصف بصفات الكمال المنزه عن النقص والزوال (تفسیر مظہری صفحہ ۴۴۳)

اس تفسیر کی بنیاد یہ ہے کہ تمام اہل علم کا اس امر پر اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا (قبل نبوت) بذریعہ الہام اس خدا کی ذات پر ایمان ہوتا ہے جو اپنے صفات کمالیہ میں منفرد ہے اور ہر زوال و نقص سے منزہ اور بری ہے

ان وضاحتوں سے معلوم ہوا کہ خدا کی ربوبیت اور وحدانیت کا علم انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی فطرت میں اس طرح ودیعت کیا گیا ہے کہ وہ ان کا

مزاج بن چکا ہے حتیٰ کہ اس دنیا میں آنے کے بعد قدرت اگر بلا تاخیر انھیں
قوتِ گویائی عطا کر دے اور ان کی زبانیں کھل جائیں تو سب سے پہلا کلمہ
جو ان کی زبان سے ادا ہوگا وہ اپنی عبودیت اور خدا کی وحدانیت و ربوبیت
کا اقرار ہوگا اس توحید کی شہادت کے بعد ہی کسی اہم مسئلے کے بارے میں
وہ کچھ بول سکیں گے جیسا کہ قرآن حکیم میں اس کی ایک مثال بھی پیش کر دی گئی
ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر عیسیٰ علیہ السلام کے خلافِ عادت
طریقے پر پیدا ہونے کی وجہ سے ان کی قوم نے بدکاری کا الزام لگا دیا خداوند
تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کی برأت و بیگناہی کی شہادت کے لئے عام عادت
کے خلاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان قبل از وقت کھول دی لیکن عیسیٰ
علیہ السلام نے زبان کھلنے کے بعد اپنی والدہ کی معصومیت اور بیگناہی
کی طرف توجہ کرنے سے پہلے عقیدۂ توحید کا اعلان و اظہار فرما دیا۔ اللہ
تعالیٰ کا ارشاد ہے

قالوا كيف نكلم من كان في المهد صبيا قال اني عبد الله	(قوم کے لوگوں نے) کہا ہم اس سے کیونکر خطاب کریں جو گود کے اندر بچے کی صورت میں ہے حضرت عیسیٰؑ بول پڑے میں اللہ کا بندہ ہوں

علامہ نسفی فرماتے ہیں۔

اعترف بالعبودية وهو	حضرت عیسیٰؑ نے جس وقت اپنی عبودیت کا اعتراف

اربعین لیلۃ او اربعین یوم (تفسیر مدارک ص۲۳ ج۲)

کیا ہے چالیس دن یا صرف ایک ہی دن کے تھے۔

اس آیت کے ذیل میں علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں۔

اول شی تکلم بہ ان نزہ جناب ربہ تعالیٰ وبرأہ عن الولد واثبت لنفسہ العبودیۃ لربہ تعالیٰ۔ (تفسیر ابن کثیر ص۱۱۹ ج۳)

حضرت عیسیٰ ؑ کی گفتگو کا سب سے پہلا جملہ یہ تھا کہ انھوں نے خداوند تعالیٰ کی تقدیس بیان کی اور اس کے لئے اولاد ہونے کی نفی کی اور اپنے حق میں اللہ تعالیٰ کی عبودیت کا اظہار کیا۔

کتاب وسنت اور اکابر علمائے امت کی یہ صراحتیں اس بات کا قابل اطمینان ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام زمانۂ نبوت کے پہلے مُلہَم ہوتے ہیں اور ان کے پاس علم کا ایک مخفی ذریعہ ایسا بھی ہوتا ہے جو عقل وحواس اور فکر واستدلال کے عام طریقے سے بالکل جدا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولی حالات کا علم رکھنے والے مسلمان بھی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ منصب رسالت ونبوت پر سرفراز کئے جانے سے پہلے شق صدر کا واقعہ آپ ؐ کی ذات بابرکات سے

لہ اخرجہ سعید ابن منصور وابن عساکر عن ابن عباس (روح المعانی ج۱۶)

ساتھ پیش آیا۔ روایتوں کے اندر اس واقعہ کے ضمن میں اس کا واقعہ موجود ہے کہ سینۂ اقدس چاک کرنے کے بعد اس کی تطہیر کی گئی اور اس کو علم وحکمت سے پُر کر دیا گیا با ایں ہمہ کسی کا بلا تخصیص یہ دعویٰ کیونکر درست ہو سکتا ہے کہ قبل نبوت عام ذرائع کے علاوہ انبیاء کرام علیہم السلام کے لیے کوئی مخصوص ومخفی ذریعۂ علم ثابت نہیں ہے اسی طرح یہ بات بھی ہرگز ماننے کے قابل نہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو توحید کا علم غور وفکر اور استدلال کرنے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے اور کسب واستدلال کے بغیر کسی نبی کو وہبی طور پر یہ علم حاصل نہیں ہوتا۔

مودودی صاحب کی دوسری تحقیق اور اس پر تنقید وتبصرہ

یہ دعویٰ کرنا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس واقعہ کے پہلے موحد نہ تھے یعنی انھیں اس کے پہلے توحید کا علم حاصل نہ تھا اس واقعہ کے ذریعہ انھوں نے استدلالی طور پر علم توحید حاصل کیا اور موحد ہوئے یہ کسی طرح درست نہیں اس لئے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ذات قدسی صفات کا تو معاملہ ہی جدا ہے عام انسانوں کی پیدائش بھی سادہ لوحی اور بے گناہی پر ہوتی ہے۔ ماں کے پیٹ سے کوئی شخص گناہ کی آلائش لئے ہوئے نہیں آتا۔ ہر شخص کا لوح فطرت سادہ اور بے داغ ہوتا ہے لیکن لوح فطرت کی

یہ سادگی اور انسان کی یہ فطری بیگناہی جو قدرت کا عطیہ ہے نفس و شیطان اور ماحول کے غلط اثرات سے رفتہ رفتہ متاثر ہوتی رہتی ہے برے ماحول اور گرد و پیش کے غلط اثرات سے اس پر بدنما نقوش پڑجاتے ہیں اس طرح اس کی فطری سادگی رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہے اور اس کے لوح فطرت پر ہزاروں داغ پڑجاتے ہیں لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کی اس فطری سادگی کو قدرت کی طرف سے محفوظ رکھا جاتا ہے اور ماحول کے غلط اثرات کی وجہ سے خداوند تعالیٰ کی خاص نگرانی کے سبب وہ داغدار ہونے سے بچ جاتی ہے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ یہی صورت پیش آتی ہے اس لئے قدرت کی اس عام فیاضی کے اصول سے انبیاء کرام علیہم السلام کو محروم رکھنا کسی طرح معقول بات نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے

انی خلقت عبادی حنفاء کلھم (مسلم[1]) — میں نے اپنے سارے بندوں کو حنفاء بھیجا ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لفظ حنفاء کی وضاحت فرماتے ہیں۔

حنفاء ای مستعدین للقبول[1] — یعنی قبولِ حق کے لئے مستعد اور شرک سے

[1] از ابن کثیر و ازالۃ الخفاء۔

الحق براء من الشرک [illegible] سے بری ہوتے ہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دنیا میں آنے والا ہر بچہ اپنی فطرت کے لحاظ سے شرک سے بری ہوتا ہے اور خداوند تعالیٰ کی توحید و الوہیت کا عقیدہ لئے ہوئے آتا ہے یا کم از کم اس کے قبول کرنے کی استعداد اس کے اندر موجود ہوتی ہے اس سے بھی زیادہ واضح طریقے پر اس مسئلے کو حدیث ذیل کے اندر بیان کیا گیا ہے۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ و ینصرانہ او یمجسانہ کما تنتج البھیمۃ بھیمۃ جمعاء ھل تحسون فیھا من جدعاء ثم یقول فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا۔ لا تبدیل لخلق اللہ ذٰلک الدین القیم۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کوئی بچہ نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اصل دینی فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اس کو یہودی بنا لیتے ہیں یا نصرانی بنا لیتے ہیں یا مجوسی بنا لیتے ہیں جیسے کہ جانور سالم بچہ دیتا ہے کیا تم اس میں کسی کو ناقص العضو پاتے ہو اس کے بعد آپؐ نے یہ آیت تلاوت کی فطرۃ اللہ التی، یعنی یہ اللہ کی تخلیق ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے خدا کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی یہی دین قیم

ہے ۔ (متفق علیہ مشکوٰۃ صفحہ ۲۱ ج ۱)

بخاری و مسلم کی اس صحیح روایت سے یہ بات صاف طریقے پر سامنے آجاتی ہے کہ دنیا میں آنیوالا ہر بچہ دین فطرت اور عقیدۂ توحید پر ہی ہوتا ہے ماحول کے اثرات سے رفتہ رفتہ اس کی فطرت اگر مسخ نہ ہو جائے تو اس کا دین اسلام ہی مانا جائے گا ۔ اس حدیث کے ضمن میں قرآن پاک کی جو آیت آگئی ہے اس کی تفسیر اور حدیث مشہور کی شرح کرتے ہوئے علمائے محققین جو کچھ تحریر فرماتے ہیں اس کا حاصل یہ ہے شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۔

(المشهور ان المراد بالفطرة
الدين الذي شرع وابتدئ
وخلق لاول منظور من البشر
وهو التوحيد ودين الاسلام
وقد وقع في رواية ما من
مولود الا وهو على الملة
وفي رواية الترمذي كل
مولود يولد على الملة والملة
هو دين الاسلام (لمعات صفحہ ۱۵ ج ۱)

اس میں سے مشہور معنٰی یہ ہے کہ فطرت سے
مراد وہ دین ہے جو انسان کے ہر نومولود
بچے کے لئے ابتدا ہی میں مخلوق و مشروع
کیا گیا ہے یہ توحید اور دین اسلام ہے
اور ایک روایت میں ہے کہ کوئی بچہ نہیں
پیدا ہوتا مگر یہ کہ وہ ملت پر ہوتا ہے
اور ترمذی کی روایت کے اندر ہے کہ کوئی
بچہ پیدا نہیں ہوتا مگر یہ کہ وہ ملت پر قائم
ہوتا ہے اور ملت دین اسلام ہی ہے ۔

شیخ نے ترمذی کی روایت کا حوالہ دیتے ہوئے یہ مشہور معنٰی تحریر کرنے کے بعد اس حدیث کا ایک اور مطلب بیان فرمایا ہے جو ان کے خیال میں زیادہ درست ہے فرماتے ہیں۔

فالصواب ان المراد بالفطرۃ	پس صحیح یہ ہے کہ اس فطرت سے مراد جس
التی خلق اللہ الخلق علیھا	پر انسان کی تخلیق کی گئی ہے وہ حیات
الحالۃ والھیئۃ المھیاۃ لمعرفۃ	حالت ہے جو قبولِ حق اور خالق کی معرفت
الخالق وقبول الحق واختیار دین	اور دین اسلام کے اختیار کرنے اور حق و
الاسلام والتمیز بین الحق و	باطل کے درمیان تمیز کرنے کے لئے
الباطل ما رکب فیھم من العقول	ودیعت کی گئی ہے جو عقل وشعور، راھداہت
التی یتمکنون بھا من الھدیٰ	اور قبولِ حق کی غرض سے انسانوں کے
وقبول الحق ولو نظروا بھا	اندر رکھے گئے ہیں اگر ان سے صحیح غور
نظراً صحیحاً لاستمروا علیٰ	وفکر کا کام لیں تو وہ اسی ابتدائی حالت
لزومھا ولم یفارقوھا کما	وہیئت پر مزور باقی رہیں گے اور اس سے
انہ یولد علیٰ محبۃ	ہٹ نہیں سکتے جس طرح بچہ دودھ پینے
ارتضاعہ اللبن	کی خواہش پر اس وقت تک قائم رہتا
(لمعات صفحہ ۵۸ / ۱)	ہے جب تک اس کو اس کی خواہش سے
. . . .	روکا نہ جائے۔

اس کے بعد دونوں مضمونوں کے درمیان جو ظاہری اور معمولی سا اختلاف نظر آتا ہے تھوڑی سی توجیہ کر لینے کے بعد شیخ لکھتے ہیں کہ معنیٰ مشہور اور اس معنیٰ کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے فرماتے ہیں۔

فلا خلاف بین التاویلین (لمعات صفحہ ۱۰۹ ج ۱)	لہٰذا دونوں معنیٰ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ حدیث کا معنیٰ اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

الاصح ان معناہ ان کل مولود یولد متھیأ للاسلام ...	اصح معنیٰ یہ ہے کہ ہر بچہ اسلام کے لئے مستعد پیدا ہوتا ہے ......
... ...	... ...
وان مات قبل بلوغہ الاصح انہ من اہل الجنۃ (نووی صفحہ ۳۳۶)	اور اگر اس کے بلوغ کے پہلے موت واقع ہو گئی تو زیادہ صحیح یہی ہے کہ وہ جنتی ہو گا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بخاری و مسلم کی اس حدیث میں سورہ روم کی جس آیت کو بطور استشہاد ذکر فرمایا ہے اس کے تحت علامہ صاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ وہی معنیٰ مشہور جو شیخ عبدالحق کے حوالے سے اوپر گذر چکا ہے اس کو نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

وقیل انھا الخلقۃ والطبیعۃ التی فی نفس الطفل یکون	اور یہ کہا گیا کہ اس سے مراد وہ فطرت و طبیعت ہے جو بچوں کی ذات میں موجود ہوتی ..

بها مهيئًا لمعرفة ربه ليس
بين قلوبهم ومعرفة ربه
حجاب كما خلق اسماعهم
وابصارهم قابلة للمسموعات
والمبصرات فما دامت باقية
على تلك الهيئة ادركت
الحق ودين الاسلام ولا يحجبها
عنهم الا وساوس الشياطين بعد
البلوغ ولذا كان كل من مات
من بني آدم قبل بلوغه
في الجنة وان كان من اولاد
المشركين وهذا القول قريب من
معنى القول الاول (تفسیر صاوی صفحہ ۲۴۳ ج ۲)

جس کے ذریعہ وہ اپنے خدا کی معرفت کے
لیے مستعد ہوتا ہے ان کے دلوں اور ان کے
رب کی معرفت کے درمیان کوئی حجاب نہیں
ہوتا جس طرح ان کے کان اور ان کی آنکھیں
مسموعات و مبصرات کے قابل پیدا کی گئی
ہیں لہٰذا یہ فطرت جب تک اس صورت پر باقی
ہے حق اور دین اسلام کا ادراک کرتی ہے
اور اس کام سے شیطانی وساوس بلوغ کے
بعد ہی ان کے لئے مانع بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے
کہ جو بچہ بلوغ کے قبل ہی مر جاتا ہے وہ
جنتی مانا جاتا ہے اگرچہ وہ بچہ مشرکین
کی اولاد میں سے ہوتا ہے اور یہ قول پہلے
قول کے بالکل قریب المعنیٰ ہے۔

دوسری روایات کے الفاظ خصوصًا ترمذی کے حوالہ سے جو روایت شیخ نے نقل کی ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور بخاری و مسلم کی حدیث کے اندر جو مسئلہ کی وضاحت کے لئے بہیمہ کی مثال ذکر کی گئی ہے ان تمام امور پر غور کرنے سے معنیٰ مشہور ہی کی تائید ہوتی ہے علاوہ بریں اگر

معنئ ثانی کو ہی درست تسلیم کرلیا جائے جب بھی حدیث سے یہ مسئلہ واضح ہے کہ ہر بچہ کا پیدائشی مذہب دین فطرت ہی ہے اور اگر بلوغ سے پہلے پہلے ماحول اور والدین کے خارجی دباؤ سے وہ محفوظ رہ گیا ہے تو وہ فطرت وملت ہی پر باقی رہتا ہے اور عقیدۂ توحید وہبی طور پر اسے حاصل ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس حالت میں اگر اس کی موت واقع ہو جاتی ہے تو اس کا شمار جنتیوں میں کیا جاتا ہے اس عام اصول سے قطعِ نظر کرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سلسلہ میں سورۂ انعام رکوع ۹ کے تحت جو کچھ مفسرین نے تحریر فرمایا ہے اس سے بھی مودودی صاحب کے مذکور الصدر دعویٰ کی تردید ہوتی ہے اس لئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ستاروں کی طرف دیکھنا ناظر کی حیثیت سے ہرگز نہ تھا یعنی یہ دیکھنا اس لئے نہ تھا کہ ستاروں میں غور وفکر کرکے اس کے ذریعہ وہ توحید کا علم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ حافظ ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

فكيف يكون ابراهيم الخليل الذي	پس حضرت ابراہیم خلیل اللہ اس حال میں غور
جعله الله امة قانتا لله حنيفا	وفکر کرنے والے کی پوزیشن میں کیونکر ہو سکتے
ولم يكن من المشركين ناظرا	ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے جماعت کا پیشوا، اپنا
في هذا المقام بل هو اولى	مطیع اور خالص توحید پرست بنایا اور مشرکوں
الناس بالفطرة السليمة	میں سے نہ ہونے دیا بلکہ حق یہ ہے کہ وہ اس

والسجية المستقيمة	معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد
بعد رسول الله بلا شك	سارے انسانوں سے زیادہ سلامتی طبع
ولا ريب	اور فطرت مستقیمہ کے بلا شک وشبہ
(تفسیر ابن کثیر صفحہ ۱۵۲ ج ۲)	حقدار ہیں۔

جملہ ارباب تحقیق اور اہل سنت اصحاب تفسیر متعلقہ آیت کے سلسلہ میں متفق اللسان ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اس موقعہ پر چاند، سورج یا ستاروں کے بارے میں ھٰذا ربی کہنا اس لئے نہ تھا کہ وہ ان مخلوقات کے ذریعہ خدا کی وحدانیت کا سراغ لگانا چاہتے تھے اور چونکہ ابھی منزلِ مقصود تک پہونچ نہیں پائے تھے یعنی اصل حقیقت منکشف نہ ہونے پائی تھی اس لئے درمیان سفر اور اثنار راہ میں ان مخلوقات کی الوہیت کا اعتراف کرتے جاتے تھے بلکہ تمام معتبر مفسرین کا فیصلہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خدا کی الوہیت کا عقیدہ اس واقعہ کے بہت پہلے سے ہی حاصل تھا اس جگہ ان کا یہ اعتراف اپنی قوم پر حجت قائم کرنے کے لئے تھا یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ اعتراف واستدلال خود اپنے لئے نہ تھا بلکہ قوم کے عقیدہ کو فرضی طریقہ پر تسلیم کر لینے کے بعد مجارات مع الخصم اور ارخاء عنان کے انداز میں اس کا رد وابطال کرنا مقصود تھا گویا قوم کے ہی عقیدے سے ان پر الزام

قائم کرنا چاہتے تھے اس طریقہ کو اصطلاحی زبان میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس موقعہ پر ناظر نہ تھے بلکہ ان کی حیثیت مناظر کی تھی مشہور محقق علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں۔

والحق ان ابراهیم علیه الصلوٰة والسلام کان فی هٰذا المقام مناظرا لقومه مبینا لهم بطلان ما کانوا علیه (ابن کثیر صفحہ ۱۵۰ ج ۲)	اور حق بات تو یہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اس موقعہ پر اپنی قوم کے لیے مناظر کی حیثیت رکھتے تھے ان کے (باطل عقائد) جن پر وہ لوگ قائم تھے ان کا بطلان واضح کرنا چاہتے تھے۔

نیز تمام مفسرین لا ایک زبان ہو کر اس اعتراف کو حقیقی اعتراف پر محمول کرنے کی تردید کرتے ہیں اور پوری قوت کے ساتھ اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں ستاروں کی الوہیت کے اقرار کر لینے پر اس کو محمول کیا جائے اگرچہ درمیانِ سفر اور اثنائے راہ کے طور پر کیوں نہ ہو کیونکہ یہ بات ایک پیغمبر کی شان سے بعید ہونے کے علاوہ خود

لہ ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس آیت میں وحاجه قومه کا جملہ موجود ہے جو اس بات کا واضح ثبوت فراہم کرتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم سے ایک مناظر کی حیثیت سے ان کے خلاف حجت قائم کر رہے تھے۔

قرآن کے اس بیان کے بھی صریح خلاف ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اس کے اندر پیش کیا گیا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی علیہ الرحمۃ تفسیر مظہری میں رقم طراز ہیں۔

وکیف یتوھم ھذا علی من عصمہ اللہ وطھرہ وآتاہ رشدہ من قبل قال ما فی الشفاء قال اللہ تعالی ولقد آتینا ابراھیم رشدہ من قبل ای ھدیناہ صغیرا قالہ مجاھد وغیرہ (مظہری ص ۲۵۹)	اس طرح کا وہم بھی اس ذات کے متعلق کیونکر کیا جا سکتا ہے جس کو خدا نے معصوم بنایا ہے اور جس کو پہلے سے ہی ہدایت دے رکھی تھی۔ شفا میں لکھا ہے کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے ولقد آتینا ابراھیم رشدہ من قبل حضرت مجاہد وغیرہ (اس آیت کی تفسیر میں) کہتے ہیں یعنی حضرت ابراہیم کو بچپنے صغر سنی میں ہی ہدایت دیدی تھی

حضرت علامہ آلوسی علیہ الرحمۃ اس بات کی تردید کرتے ہوئے کہ فی الواقع حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کی الوہیت کا ایک لمحہ کے لئے بھی اعتراف کیا ہو تحریر فرماتے ہیں۔

وقد قص اللہ تعالی من حال ابراھیم علیہ السلام خصوصا فی صغرہ ما لا یتوھم منہ	اور اللہ تعالی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جس طرح حال بیان فرمایا ہے بالخصوص ان کی صغر سنی سے متعلق جو کچھ بیان

شائبۃ مما ینافیہ ذلک فالوجہ الاول لا غیر (روح المعانی ص ۱۹۹ ج ۷)	فرمایا ہے اس کے بعد ایسے کسی امر کا وہم ہو ہی نہیں سکتا۔ جس کے اندر اس بیان کے منافی ہونے کا ادنیٰ درجہ میں بھی کوئی شائبہ پایا جاتا ہو لہٰذا پہلی تفسیر (یعنی وہی کہ یہ ارخاء عنان اور مجارات مع الخصم ہے) کے سوا کوئی درست نہیں۔
. . . . . .	
. . . . . .	

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم ع سے متعلق جو کچھ ذکر فرمایا ہے خصوصًا ان کے زمانۂ طفولیت کے بارے میں قرآن نے جو باتیں بتائی ہیں ان سب کو دیکھتے ہوئے اس بات کی قطعًا کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ستاروں کے بارے میں ھٰذا ربی کہنا ان ستاروں کی الوہیت کے واقعی اقرار واعتراف کے طور پر تھا اس چیز کا ان پر شبہ کیونکر کیا جا سکتا ہے جب کہ ان کے متعلق قرآن کا واضح بیان ہے

انّ ابراھیم کان امۃ قانتا للہ حنیفًا ولم یک من المشرکین (پارہ ۱۴ ع ۱۶)	یقینًا ابراہیمؑ پیشوا، خدا کے مطیع، پکے موحد تھے اور ہرگز وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

ولقد آتینا ابراھیم رشدہٗ ‏ ‏ بلاشبہ ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی ہدایت
من قبل۔ ‏ ‏ پہلے ہی دیدی تھی۔

گذر چکا ہے کہ حضرت مجاہد وغیرہ نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ زمانۂ طفولت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو راہِ حق کا عرفان حاصل ہو چکا تھا پس حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق قرآن کی ان تصریحات کے خلاف یہ کس طرح باور کر لیا جائے کہ ستاروں کے دیکھنے سے پہلے وہ خدا کی الوہیت کے عقیدہ سے بالکل خالی تھے اور مشرکانہ ماحول میں پیدا ہونے کی وجہ سے انھیں راہ حق اب تک کہیں سے نہ مل سکی تھی خاص اس واقعہ سے ہی انھوں نے حصول توحید کی غرض سے غور و فکر کے ذریعہ سفر شروع کیا تھا اور اثنائے راہ میں ان ستاروں کی واقعی الوہیت کا وہ اقرار کرتے جاتے تھے لیکن یہ اقرار و اعتراف اثنائے راہ میں پیش آیا لہٰذا محض مودودی صاحب کے فرما دینے کی وجہ سے قابلِ اعتبار نہیں ہو سکتا حالانکہ اس بات کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے جو کچھ اس موقع پر مولانا مودودی صاحب نے تحریر فرمایا ہے بالکل اسی انداز کی بات ابو مسلم نے اس آیت کے تحت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کہا ہے۔

فنظر نظرۃً فی النجوم فقال ‏ ‏ انھوں نے ایک بار ستاروں میں دیکھا
انی سقیم (پارہ ۲۳) ‏ ‏ پھر کہا میں سقیم ہوں۔

اس کا مطلب ابو مسلم بیان کرتے ہیں۔

ان المعنی نظر و تفکر فی النجوم یستدل باحوالها علی حدوثها وانها لا تصلح ان تکون آلهة تعالی الخ سقیم۔ ای سقیم النظر حیث لم یحصل له کمال الیقین۔	معنیٰ یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے ستاروں میں غور و فکر اس خیال سے کیا تھا کہ ان کے حالات سے ان کے فانی ہونے پر اور اس بات پر استدلال کریں کہ وہ الٰہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے لیکن حضرت ابراہیمؑ نے کہا میں سقیم ہوں یعنی یہ کہا کہ میری نگاہ میں سقم ہے (یہ انھوں نے اس لئے کہا تھا کہ وہ اثنائے راہ میں تھے) اور انھیں کامل یقین حاصل نہ ہو سکا تھا۔

ہر شخص باسانی سمجھ سکتا ہے کہ ابو مسلم نے وہی بات کہی تھی جس کو مودودی صاحب سمجھانا چاہتے ہیں۔ یعنی صرف لفظی ہیر پھیر سے بالکل یہی چیز مودودی صاحب نے آیت زیر بحث میں پیش کرنا چاہا ہے اس لئے دونوں باتیں حقیقت میں ایک ہی ہیں اب غور فرمائے ابو مسلم کے اس خیال کے بارے میں علماء کیا حکم صادر فرماتے ہیں۔ مفتی بغداد علامہ آلوسی علیہ الرحمۃ ابو مسلم کا مذکور الصدر قول نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

وهذا لعمری یسلب	میں اپنی حیات کی قسم دکھا کر کہتا ہوں،

نیما ۲ رد عن ابی مسلم الاسلام وفیہ من الجہل بمقام الانبیاء لاسیما الخلیل علیہم السلام (روح المعانی صفحہ ۱۷۲)	کہ میرا خیال ہے کہ یہ بات ابو مسلم سے اس کا ایمان سلب کر لینے والی ہے (یعنی ایمان کے دائرہ سے خارج کر دینے والی ہے) اور اس قول میں انبیاء علیہم السلام بالخصوص حضرت ابراہیمؑ کے مقام نبوت سے جہالت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اب فیصلہ ناظرین کے ذمہ ہے وہ خود غور کریں کہ مولانا مودودی نے اس موقعہ پر کتنی خطرناک غلطی کی ہے، اور اپنی تفسیر کے مطالعہ کرنے والوں کے ذہن میں کیا چیز اتارنے کی کوشش کی ہے۔

مولانا مودودی کی تیسری تحقیق اور اس کا تنقیدی جائزہ

اب تک جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں ان سے معلوم ہو چکا ہے کہ اس موقعہ پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کی واقعی الوہیت کا اقرار کیا تھا بلکہ جمہور محققین کے نزدیک ان کا یہ اعتراف محض اپنی قوم پر الزام قائم کرنے کے لئے ارخاء عنان اور مجارات مع الخصم کے طور پر تھا۔ ظاہر ہے اپنی قوم کے ساتھ بحث و مباحثہ یا اتمام حجت سن شعور اور بلوغ کے بعد ہی کیا ہوگا جیسا کہ دوسرے قرائن و شواہد سے اس کی تائید ہوتی ہے اس لئے جن لوگوں نے ان کے اس اعتراف

کو ارخاء عنان اور الزام خصم پر محمول کیا ہے ان کے نزدیک صحیح یہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ یہ واقعہ سنِ بلوغ کے بعد پیش آیا ہے ان کا یہ قول مجارات مع الخصم کے قبیل سے ہے۔ علامہ خازن فرماتے ہیں۔

والقول الثانی الذی علیہ جمہور المحققین ان ھذہ الرویۃ وھذا القول کان بعد بلوغ ابراھیم وحین شرفہ اللہ بالنبوۃ واکرمہ بالرسالۃ (تفسیر خازن صفحہ ۳۹ ج ۲)	اور دوسرا قول جس پر جمہور محققین ہیں وہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ستارے کی طرف دیکھنا اور یہ (ھذا ربی) کہنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بالغ ہونے کے بعد اور اس وقت کا واقعہ ہے جب انھیں شرفِ نبوت سے نوازا گیا تھا اور منصبِ رسالت پر سرفراز کردیا گیا تھا۔

لیکن اس کے برخلاف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس اعتراف کو ستاروں کی واقعی الوہیت کے اقرار پر جن لوگوں نے محمول کرنا چاہا ہے اس سے قطعِ نظر کہ یہ بات بجائے خود غلط ہے لیکن انھوں نے بھی اس احتیاط کی سخت ضرورت محسوس کی ہے کہ اس صورت میں واقعہ قبل بلوغ اور سنِ شعور کے پہلے کا مانا جائے تاکہ نبوت اور بلوغ یا سنِ شعور کے زمانے سے ایک پیغمبر کی طرف شرک کی نسبت نہ کرنی پڑے مگر مودودی صاحب

نے اس جگہ دو دو غلطی کا ارتکاب کیا ہے وہ اس طرح کہ ایک طرف وہ اس واقعے کو سنِ شعور کے بعد اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سنِ رشد کو پہونچنے کے بعد کا واقعہ مانتے ہیں اور دوسری طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اقرار کو ستاروں کے واقعی الوہیت کا اقرار تسلیم کرتے ہیں۔ آخری بات ان کی تحریر کے حوالے سے پہلے گذر چکی ہے اور اس پر تفصیلی نقل و تبصرہ بھی ناظرین کے سامنے آچکا ہے اس بحث میں ان کے اس نظریئے کی تنقید اور اس کا تجزیہ پیش کرنا ہے کہ یہ واقعہ ستاروں کی واقعی الوہیت کے اقرار و اعتراف کی صورت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سنِ رشد کو پہونچنے کے بعد کا ہے جیسا کہ مودودی صاحب باور کرانا چاہتے ہیں حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس قول کو جن لوگوں نے واقعی الوہیت کے اقرار پر محمول کرنا چاہا، انھوں نے واقعہ سن رشد اور بعد بلوغ کا قرار دیا ہے اگرچہ ان کے اس نظریہ کی اکابر مفسرین نے تردید کی ہے اور اس خیال کو بالاتفاق باطل قرار دیا ہے امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

منهم من قال ان هٰذا	جن لوگوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے
كان بعد البلوغ	اس قول کو واقعی الوہیت کا اقرار سمجھا ہے)
وجرياني قلم التكليف	ان میں سے کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ یہ واقعہ
عليه و منهم من	بلوغ اور قلم تکلیف کے جاری ہونے کے

قال ان هذا کان قبل البلوغ واتفق اکثر المحققین علیٰ فساد القول الاول واحتجوا علیه بوجوہ (تفسیر کبیر مصری)

بعد کا ہے اور ان میں سے کچھ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ واقعہ بلوغ کے پہلے کا ہے مگر محققین کی اکثریت نے پہلے قول کے باطل ہونے پر اتفاق کیا ہے اور اس کے خلاف مختلف دلائل سے استدلال کیا ہے۔

اس کے بعد امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے بارہ دلائل کے ذریعہ ان لوگوں کے خلاف حجت قائم کی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس قول کو ستاروں کے واقعی الوہیت کے اعتراف واقرار پر محمول کرتے ہوئے بھی واقعہ زمانۂ بلوغ کا تسلیم کرتے ہیں۔ دلائل کی تفصیلی وضاحت کے لیے تفسیر کبیر کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ میں نے اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کو ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا علاوہ بریں دوسرے محققین نے اس کی بھی تردید کی ہے کہ واقعی اقرار الوہیت پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس قول کو محمول کر کے واقعہ بلوغ کے پہلے کا مانا جائے اور یہ کہا جائے کہ زمانۂ بلوغ کے پہلے پہلے صغر سنی اور طفولیت کی حالت میں تکلیف شرعی نہ ہونے کی وجہ سے کفر وشرک یا توحید کے معاملے میں تحیّر و تردد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے مضر نہیں ہے تو اس خیال کی تردید

کرتے ہوئے علامہ خازن تحریر فرماتے ہیں۔

قالوا هذا يدل على نوع تحيير وذالك لا يكون الا في حال الصغر قبل البلوغ وقيام الحجة وهذا القول ليس بسديد ولا مرضي لان الانبياء معصومون في كل حال من الاحوال وانه لا يجوز ان يكون لله عزوجل رسول ياتي عليه وقت من الاوقات الا وهو بالله عارف وله موحد ومن كل منقصة منزه ومن كل معبود سواه بري وكيف يتوهم على ابراهيم وقد عصمه الله وطهره واتاه رشده من قبل۔

(تفسیر خازن صفحہ ۲۹ ج ۲)

بعض لوگوں نے کہا کہ یہ واقعہ ایک قسم کے تحیر و تردد پر دلالت کرتا ہے جو قیام حجت اور بلوغ کے پہلے صرف کم عمری ہی میں ہو سکتا ہے (لہٰذا یہ واقعہ قبلِ بلوغ کا ہے) لیکن یہ قول نہ کسی طرح درست ہے اور نہ ہی قابلِ قبول اس لئے کہ انبیاء کرام علیہم السلام ہر حالت میں معصوم ہوتے ہیں ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ خدا کا کوئی رسول ہو جس پر ایک لمحہ کا بھی وقت گزر جائے مگر یہ کہ وہ خدا کی الوہیت کا قائل ہوتا ہے عارف باللہ ہوتا ہے۔ خدا کی ذات کو ہر ذات ماسوا سے بری جانتا ہے۔ پھر حضرت ابراہیمؑ کے متعلق یہ بات دائرہ میں بھی کیوں کر آ سکتی ہے جب کہ خدا نے انھیں معصوم اور گناہوں سے پاک بنایا ہے اور ان کو ہدایت بھی پہلے ہی عطا کر دی ہے۔

اسی طرح علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ اس نظریئے کا ابطال کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

وزعم انہ علیہ السلام	اور یہ گمان کرنا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام
قال ما قال ان لم یکن	نے جو کچھ کہا تھا وہ اسی وقت کہا تھا جب
عارفا بربہ سبحانہ	کہ وہ اپنے رب سبحانہ تعالیٰ کو پہچانتے نہ
والجہل حال الطفولیۃ	تھے اور کم سنی میں قیام حجت کے پہلے
قبل قیام الحجۃ	جہالت مضر نہیں ہے لہٰذا اس وقت کی یہ
لایضرہ ولا یعد ذالک	بات کفر نہیں سمجھی جائے گی تو یہ خیال کسی
کفرا مما لایلتفت الیہ اصلا	طرح بھی اس قابل نہیں کہ اس پر دھیان
فقد قال المحققون انہ	دیا جائے کیونکہ محققین علماء تصریح
لایجوز ان یکون للہ رسول	کر چکے ہیں کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اللہ کا
یاتی علیہ وقت من الاوقات	کوئی ایسا رسول ہو جس پر ایک لمحے کا وقت
الا وھو للہ موحد	بھی گذر جائے مگر یہ کہ وہ خدا کی توحید
وبہ عارف ومن کل	کا قائل ہوتا ہے ۔ عارف باللہ ہوتا ہے
معبود سواہ بری	اور خدا کی ذات کو ہر معبود ماسوا سے بری
(روح المعانی صفحہ ۱۹۹)	جانتا ہے ۔

تفسیر خازن اور روح المعانی کے ان حوالوں کے سامنے آجانے کے بعد

یہ حقیقت بے غبار ہو جاتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول کو ستاروں کی الوہیت کے واقعی اور نفس الامری اقرار کے ساتھ واقعہ کو بلوغ کے قبل بتانا یا توحید کے معاملہ میں حضرت ابراہیمؑ کی طرف زمانۂ بلوغ کے پہلے بھی کسی تحیر و تردد کی نسبت کرنا بالاتفاق تمام محققین اہلسنت کے نزدیک باطل ہے چہ جائیکہ سن شعور کے بعد شرک یا تحیر و تردد اور توحید کے بارے میں کسی شک کی نسبت حضرت ابراہیمؑ کی طرف کرنا جیسا کہ مودودی صاحب نے کیا ہے یہ احتمال تو کسی طرح درست ہو ہی نہیں سکتا اگرچہ مذکور الصدر حوالوں کے بعد اور کسی ثبوت کی حاجت باقی نہیں رہ جاتی ہے لیکن ناظرین کے اطمینان کے لئے مزید ایک تفسیر کا حوالہ درج کیا جاتا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

والصحیح ھو القول الاول اذ لا یجوز ان یکون للہ رسول یاتی علیہ وقت من الاوقات الا وھو للہ موحد وبہ عارف ومن کل معبود سواہ بری۔

قول اول ہی صحیح ہے (یعنی یہ کہ حضرت ابراہیمؑ نے الزام قائم کرنے کے لئے ارخاء عنان اور مجارات مع الخصم کے طور پر ستاروں کی الوہیت کا اقرار کیا تھا) اس لئے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اللہ کا کوئی رسول ہو جس پر ایک لمحہ کا وقت گذر جائے مگر یہ کہ وہ خدا کی وحدانیت کا قائل عارف باللہ

(تفسیر مظہری صفحہ ۲۵۴/۳) ہوتا ہے اور خدا کی ذات کو ہر معبود سے بری جانتا ہے

مولانا مودودی صاحب کا آخری مغالطہ اور اس کی حقیقت

مولانا مودودی صاحب کی تفسیر کے حوالہ سے جو عبارت گذر چکی ہے اس کے آخری جملے یہ ہیں "تیج کی منزلیں گویا ئے حق کے لئے ناگزیر ہیں ان پر ٹھہرنا بسلسلۂ طلب وجستجو ہوتا ہے نہ کہ بصورت فیصلہ۔ اصلاً یہ ٹھہراؤ سوالی اور استفہامی ہوا کرتا ہے نہ کہ حکمی طالب جب ان میں سے کسی منزل پر رک کر کہتا ہے "ایسا ہے" تو یہ دراصل اس کی آخری رائے نہیں ہوتی بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ "ایسا ہے؟" اور تحقیق سے اس کا جواب نفی میں پاکر وہ آگے بڑھ جاتا ہے اس لئے یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ اثنائے راہ میں جہاں جہاں وہ ٹھہرتا رہا وہاں وہاں وہ عارضی طور پر کفر و شرک میں مبتلا رہا (تفہیم القرآن صفحہ ۵۵۸/۱)

ان سطروں میں مودودی صاحب دراصل یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ جو کچھ اس موقعہ پر میں لکھ رہا ہوں وہ دوسرے مفسرین نے بھی اس جگہ لکھا ہے فرق صرف انداز تعبیر کا ہے ورنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول "ہٰذا ربی" کو استفہام پر مفسرین نے محمول کیا ہے اور یہی بات میں سمجھانا چاہتا ہوں اس لئے یہ چیز نہایت ضروری ہو جاتی ہے کہ ناظرین کو مودودی صاحب کے فریب سے باخبر کرنے کے لئے اس کی اصل حقیقت واضح کر دی جائے

بنابریں سب سے پہلے اس احتمال کی توضیح ضروری ہے جو اس جگہ بعض مفسرین نے تحریر فرمایا ہے وہ یہ ہے علامہ خازن لکھتے ہیں ۔

الوجه الثانی ان ابراهیم علیه السلام قال هذا القول علی سبیل الاستفهام وهو استفهام انکار وتوبیخ لقومه تقدیره اهذا ربی الذی تزعمون . . . والمعنی ایکون هذا ربا ودلائل النقص فیه ظاهرة (تفسیر خازن ص ۲۹ ج ۲)	دوسری توجیہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ جملہ بطور استفہام کہا تھا اور یہ استفہام اپنی قوم پر انکار و توبیخ کے لئے تھا اصل عبارت یہ ہے کیا یہی میرا رب ہے جس کا تم دعویٰ کرتے ہو . . . . . . معنیٰ یہ ہوئے کہ کیا یہ رب ہو سکتا ہے جب کہ اس کے اندر نقص و عیب کے آثار بالکل ظاہر ہیں ؟

مفسرین کی پیش کردہ توجیہ کا حاصل یہ ہوا کہ اس قول میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کی الوہیت کا اعتراف و اقرار کیا ہی نہیں ہے وہ تو خدا کی الوہیت کے بہت پہلے ہی سے قائل تھے یہ بات ان کے اندر ممکن ہی نہیں ہو سکتی کہ وہ خود حصول علم کی غرض سے غور و فکر یا کوئی سوال و استفہام کریں بلکہ اپنی قوم کے عقیدہ کو رد کرنے کے لئے انھوں نے ستاروں میں غور و فکر کرنے کے بعد چونکہ ان کی عدم الوہیت کے دلائل واضح تھے اس لئے اپنی قوم پر الزام عائد کرتے ہوئے بطور زجر و توبیخ ان سے کہا

کیا تمہارے گمان کے مطابق یہی میرا رب ہے جس کے اندر زوال کے آثار بالکل ظاہر اور واضح ہیں یعنی وہ رب کیوں کر ہوسکتا ہے جو فانی اور زوال پذیر ہے پس معلوم ہوگیا کہ مفسرین کے تحریر کردہ استفہام کا یہ منشا نہیں ہے کہ نعوذ باللہ خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہی پہلے سے خدا کی الوہیت کا علم حاصل نہ تھا یا وہ اس معاملہ میں تردد و تحیر یا کسی شک میں مبتلا تھے اور ان کا یہ قول حصولِ علم اور آخری فیصلہ کرنے سے پہلے کسی درمیانی مرحلہ کا عارضی اعتراف و اقرار ہے جیسا کہ مودودی صاحب سمجھانا چاہتے ہیں مفسرین نے استفہام کو انکار و توبیخ پر محمول کیا ہے نہ کہ استفہام طلب و سوال پر۔ استفہام انکاری کا مطلب ہے مخاطب کے معلوم نظرئیے کا باطل کرنا اور اس کے تسلیم کرنے سے انکار کرنا اور استفہام سوالی یا حکمی کا مطلب ہے کسی غیر معلوم چیز کا دریافت و معلوم کرنا اور اس کی تحقیق و جستجو کرنا دونوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے جو کچھ مفسرین نے تحریر کیا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ابراہیم علیہ السلام کی طرف ستاروں کی الوہیت کا عقیدہ یا کفر و شرک کی نسبت اثنائے راہ میں عارضی ہی طور پر سہی ایک لمحہ کے لئے بھی درست ماننے کی ضرورت پیش آئے اس کے برخلاف یہ چیز مودودی صاحب کی اختیار کردہ راہ کے لئے بالکل ناگزیر ہوجاتی ہے۔ باقی مودودی صاحب کا یہ لکھ دینا کہ وہ عارضی اور اثنائے راہ کی بات ہے آخری فیصلہ

نہیں ہے لہٰذا کوئی مضائقہ نہیں یہ تو خود ان کے ذہن کی بات ہے ورنہ علامہ آلوسی وغیرہ کے حوالے سے گذر چکا ہے کہ سن شعور کے بعد تو یہ چیز بڑی بات ہے صغر سنی اور کم عمری میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف اس کی نسبت ہرگز درست نہیں ہے۔

انبیاء کرام پر نفس یا شیطان کا کبھی غلبہ نہیں ہوتا

یہ چیز اپنی جگہ مسلم ہے کہ ہر انسان کے ساتھ دو ازلی دشمن لگے ہوئے ہیں جن سے کوئی فرد بشر خالی نہیں ہے ان میں سے ایک دشمن داخلی ہے اور ایک خارجی اور یہی دونوں درحقیقت تمام شر و فساد کا سرچشمہ ہیں یہ نفس اور شیطان ہیں اگرچہ یہ دونوں ہی انبیاء کرام علیہم السلام کے اندر بھی موجود رہتے ہیں اور کسی حد تک ان کے طبعی تقاضے بھی موجود ہوتے ہیں لیکن قدرت ابتدا ہی سے انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے ایسا نظم کرتی ہے کہ ان دونوں کا بالکل مزاج ہی بدل جائے یا کم سے کم ان کے ہر حملہ سے انبیاء کرام کو محفوظ رکھا جائے اس لئے ان پر نفس یا شیطان کا کوئی داؤ کامیاب نہیں ہو پاتا۔ کتاب وسنت کے ساتھ انبیاء کرام کے حالات میں غور کرنے سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ان دونوں میں سے کسی کا کبھی ان پر غلبہ نہیں ہو پاتا ہے اس بات کا ثبوت کہ شیطان کا ان پر کبھی غلبہ نہیں ہو سکتا ذیل کی حدیث کے اندر موجود ہے

عن ابن مسعودؓ قال قال رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم مامنکم من احد اِلّا وقد وکل به قرینه من الجن وقرینه من الملٰئکة قالوا و ایاك یا رسول اللّٰه قال ایای ولکن اللّٰه اعاننی علیه فاسلم فلا یامرنی الا بخیر ۰

(مشکوٰۃ ص ۱۸ ج ۱)

حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر شخص کے ساتھ یہ بات پیش آتی ہے کہ اس کا ایک ساتھی شیطان مقرر کیا جاتا ہے اور ایک ساتھی فرشتہ مقرر ہوتا ہے صحابۂ کرامؓ نے دریافت کیا یا رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ معاملہ آپ کے ساتھ بھی پیش آیا ہے، حضورؐ نے فرمایا ہاں میرے ساتھ بھی لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر غالب کر دیا اس لئے وہ شیطان مطیع ہو گیا پس وہ مجھے صرف اچھے کاموں کا ہی حکم دیتا ہے۔

حدیث میں اس بات کی کھلی تصریح ہے کہ یہ شیطان انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ہمزاد و قرین ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ انبیاء کرامؑ کو اس کے شر سے محفوظ کر دیتے ہیں بلکہ حد تک ان کا مطیع و فرماں بردار

یہ حدیث مختلف صحابہؓ سے ان کتابوں میں بھی روایت کی گئی ہے مسلم، نسائی، ترمذی، دارمی، احمد، طبرانی، کبیر ابو یعلی سعید ابن منصور بن حبان بغوی دیکھئے تنقیح الرواۃ و مرعاۃ و مرقاۃ

بنادیا جاتا ہے اور اغوا و اضلال کے بجائے اچھے کاموں میں اپنی فطرت کے خلاف تعاون کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اس حدیث میں مطیع وفرماں بر دار بنائے جانے کے سلسلے میں کسی وقت کا تعین نہیں کیا گیا جس سے بظاہر یہی واضح ہوتا ہے اس اطاعت وفرماں برداری کا آغاز ابتدا سے ہی ہوجاتا ہے اور اس کے شر سے حفاظت وعصمت کا سلسلہ انبیاء کرامؑ کے ولادت کے بعد ہی شروع ہوجاتا ہے اس خیال کی تائید ان روایتوں سے بھی ہوتی ہے جن کے اندر فَاَسْلَمَ صیغہ ماضی کے بجائے فَاَسْلَمُ صیغہ مضارع وارد ہے بلکہ بعض اہل علم نے اس صورت کو زیادہ بہتر قرار دیا ہے بعض علماء نے قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے امت کے اس اجماعی عقیدہ کی تصریح کی ہے۔

انّ الامة مجتمعة علیٰ عصمة النبی صلی اللہ علیه وسلم من الشیطٰین فی جسمه و خاطره ولسانه.

(مرقاۃ ص ۸۸، ج ۱)

ساری امت اس بات پر متفق ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جسم، اپنے قلب اور اپنی زبان میں شیطان کے اثر سے محفوظ رکھے گئے ہیں۔

دوسرا دشمن نفس ہے یہ بھی ہر انسان کی طرح انبیاء کرامؑ کے اندر موجود ہوتا ہے اور کسی حد تک اپنی فطرت کے تحت کبھی کبھی شرارت کرنا چاہتا ہے لیکن شیطان ہی کی طرح اللہ تعالیٰ انبیاء کرامؑ کی اس سے بھی حفاظت

فرماتے ہیں اور یہ ہمیشہ اپنے داؤں میں ناکام رہتا ہے۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ایک پیغمبر کی زبان سے یہ اقرار بھی نقل فرمایا ہے۔

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ	نفس بلاشبہ برائی کا حکم دینے والا ہے لیکن میرا رب جس پر رحم فرمادے (وہ اس کے شر سے محفوظ ہوجاتا ہے)

اس آیت کے اندر یوسف علیہ السلام کے اقرار کے تحت جہاں اس بات کی صراحت ملتی ہے کہ نفس انبیاء کرام علیہم السلام کے اندر پایا جاتا ہے اور وہ امّارہ بالسوء بھی ہوتا ہے وہاں اسی آیت کے اندر اس بات کی غیر مبہم تصریح بھی پائی جاتی ہے کہ خداوند تعالیٰ کی رحمت ان انبیاء کرام علیہم السلام کی نفس کے مقابلہ میں ہمیشہ دستگیری کرتی ہے اور نفس اپنے داؤں میں کبھی کامیاب نہیں ہو پاتا۔ اللہ تعالیٰ اس کے شر سے انبیاء کرام علیہم السلام کو محفوظ رکھتے ہیں چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں۔

اما آنکہ انبیاء کرام علیہم السلام در اخلاق جبلیہ خود فوقیت دارند بر غیر خویش ایں نیز از بدیہیات ملت است و کسیکہ بقوانین حکمت خلقیہ مطلع است	رہی یہ بات کہ انبیاء علیہم السلام اپنے فطری اخلاق میں غیروں پر فوقیت رکھتے ہیں تو یہ مسئلہ بھی مذہب کے بدیہی مسائل میں سے ہے اور جو شخص بھی تخلیقی حکمت کے اصول سے واقف

بضرورت می دانند کہ انتظام اخلاق جمیلہ باین روش کہ در انبیاءؑ ظاہر شد بدون انقیاد نفس قلب را و قلب عقل را میسر نیست ۔ (ازالۃ الخفاء صفحہ ۵۹)

یا با بداہت اس بات کو جانتا ہے کہ جس طرح یہ اخلاق انبیاء کرامؑ میں ظہور پذیر ہوتے ہیں اس انداز سے ان اخلاق جمیلہ کا منتظم ہو جانا نفس کی اطاعتِ قلب اور قلب کی اطاعت عقل کے بغیر ممکن نہیں ہے ۔

شاہ صاحبؒ کی اس تصریح سے معلوم ہوا کہ انبیاء کرامؑ کا نفس ان کے قلب کے تابع ہوتا ہے اور ان کا قلب عقل کے تابع ہوتا ہے اس لئے ان کا ہر عمل عقل کے تقاضہ کے مطابق ہوتا ہے ۔

عصمتِ انبیاءؑ سے متعلق مودودی صاحب کی دوسری کوتاہیاں

مودودی صاحب کی عبارت کا جو اقتباس ناظرین کے سامنے پیش کیا گیا تھا اس کے پہلے جملے پر مکمل تحقیقی بحث گذشتہ صفحات میں پیش کی گئی ہے جس کے ذیل میں مسئلہ کے تقریبًا ہر پہلو پر روشنی پڑ چکی ہے لیکن دوسرے جملوں کے اندر مودودی صاحب کی جو خامیاں ہیں ان کی نشاندہی ابھی باقی ہے اس لئے ان پر کلام کرنا بھی ضروری ہے اگرچہ اس موقعہ پر ہم بے حد اختصار سے کام لیں گے ۔

مودودی صاحب کی زیر نظر عبارت کا دوسرا جملہ یہ تھا

۲؎ ورنہ اگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت تھوڑی دیر کے لئے بھی ان سے منفک ہو

جائے تو جس طرح عام انسانوں سے بھول چوک اور غلط فہمی ہو جاتی ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام سے بھی ہو سکتی ہے۔

انبیاء کرامؑ کے بارے میں یہ خیال کہ وہ کسی وقت عام انسانوں کی طرح غیر معصوم ہو سکتے ہیں بہت ہی خطرناک قسم کی غلطی ہے، عام انسان تو غیر معصوم ہونے کی وجہ سے بھول چوک اور غلط فہمی میں بڑے بڑے گناہ کا ارتکاب کر لیتے ہیں حتیٰ کہ ان سے کفر وشرک کا صدور بھی ہو جاتا ہے کیا انبیاء کرام علیہم السلام سے بھی مودودی صاحب کے خیال کے مطابق غیر معصوم ہو جانے کی صورت میں یہ سب کچھ ہو سکتا ہے، اگر ہو سکتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے کسی قول وعمل کو سند نہ بنایا جائے کیونکہ اس صورت میں ان کے ہر قول وعمل کے متعلق اس بات کا احتمال ہوگا کہ وہ عصمت کے منفک ہو جانے کے وقت ہی صادر ہوا ہو حالاں کہ صحابہ کرامؓ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول وعمل کو دلیل خصوص نہ ہونے کی صورت میں بغیر کسی تامل وتاخیر کے اپنا لینا اس نظریے کی قطعی نفی کرتا ہے درحقیقت یہ امکان نبی کی ذات سے وثوق واعتماد ہی کو متزلزل کر دیتا ہے بلکہ اس احتمال کو درست مان لینے کے بعد پورے دین سے ہی بے اعتمادی پیدا ہو جائے گی اس لئے کہ سارے اعتماد ووثوق کی بنیاد ہی نبی کی ذات کے معصوم ومحفوظ ہونے پر قائم ہے انکی عصمت وحفاظت ختم ہو جانے کے بعد جو عام انسانوں کے اعمال واقوال کا حال ہے

وہی حال ان کا بھی ہو جاتا ہے جس کے بعد کسی اعتماد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مسئلہ کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ عبد العلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

لو جوز ھٰذا الامر لما بقی الا مان فی امر التبلیغ وھو ظاھر (فواتح الرحموة ص ۳۸۷)

اگر اس صورت کو درست مان لیا جائے تو شریعت کے معاملے میں اعتماد ہی ختم ہو جائے گا حالانکہ یہ بات جس قدر خطرناک ہے وہ ظاہر ہے۔

پس معلوم ہوا کہ اس موقع پر زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ عصمت کے منفک ہوئے بغیر انسانی فطرت کے تقاضوں کے تحت انبیاء کرام علیہم السلام سے کسی وقت کسی لغزش کا ہونا ممکن ہے لیکن من جانب اللہ ان کو تنبیہ کر دی جاتی ہے اور اس پر ہرگز قائم نہیں رہنے دیا جاتا مگر یہ خیال کہ ان کی عصمت ہی ختم ہو جائے اور عام انسانوں کے درمیان اور ان کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہے یہ بہت خطرناک قسم کی بات ہے اس جگہ ناظرین کو شبہ نہ ہونا چاہئے کہ مودودی صاحب نے تو اگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت تھوڑی دیر کیلئے بھی ان سے منفک ہو جائے تحریر فرمایا ہے جو فرض محال کے درجے کی بات ہے نہ کہ لازمی طور پر فی الواقع یہ چیز مودودی صاحب کی خیال میں ہو جاتا ہی

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں **انا لو جوزنا علیھم شیئاً من ذٰلک بطلت الشرائع ولم یوثق بشئیٍ مما یذکرون انہ من وحی اللہ تعالٰی روح المعالی ص ۲۲.**

کوئی ضروری بات ہے یہ شبہ اس لیے غلط ہے کہ مودودی صاحب نے اگلے جملے میں خود ہی اس کی بھی تصریح کردی کہ یہ بات فرض محال کے درجے کی نہیں ہے بلکہ ان کے خیال میں یہ معاملہ ہر نبی کے ساتھ کبھی نہ کبھی ضرور واقع ہوتا ہے بنا بریں اب کسی توجیہ کے لئے بھی مودودی صاحب کے کلام میں کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی وہ خود فرماتے ہیں ۔

(۳) اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اٹھا کر ایک دو لغزش سرزد ہونے دی ہے ۔

اس جگہ مودودی صاحب صرف لغزش کا ہونا ہی تحریر فرماتے تو بات کسی طرح بن سکتی تھی مگر اس صورت میں نہ یہ لغزش عصمت کے منافی سمجھی جاتی اور نہ اس کی وجہ سے عصمت وحفاظت اٹھانے کی ضرورت پیش آتی ہے کیونکہ جن بزرگوں نے کسی لغزش کا وجود انبیاء سے جائز مانا ہے انھوں نے اس کو عصمت کے منافی نہیں سمجھا ہے ورنہ وہ بھی مودودی صاحب کی طرح عصمت کے اٹھائے جانے کی تصریح ضرور کرتے لیکن ایسا کسی نے نہیں کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لغزش ان کے یہاں اس درجے کی چیز ہی نہیں ہوتی کہ اس سے انبیاء کرام کی عصمت کے متاثر ہو جانے کا اندیشہ ہو مگر مودودی صاحب کے نزدیک یہ لغزش اس درجہ خطرناک ہوتی ہے کہ اس کے لئے عصمت کا اٹھا دیا جانا بھی ضروری ہے حالانکہ زمانۂ نبوت

میں عصمت وحفاظت کے زوال وانفکاک کا یہ نظریہ اجماعِ امت کے خلاف ہے
اور سلبِ عصمت کے اس عقیدے کا مودودی صاحب کے علاوہ کسی دور میں
بھی امت کے اندر کہیں سراغ نہیں ملتا ہے گذر چکا ہے کہ عصمت نبوت کے
ممتاز اجزا میں سے ایک جز ہے۔ جز کا اپنے کل سے منفک ہونا کیونکر ممکن
ہے۔ اخیر میں یہ بات بھی ذہن نشین رہ چاہئے کہ لغزش یا بھول چوک کا
واقع ہونا۔ اسی طرح اس پر بازپرس اور مواخذہ کا ہوجانا اس بات کی دلیل
ہے کہ جس مخلوق سے یہ لغزش صادر ہوئی یا جس کا اس پر مواخذہ کیا گیا ہے
وہ ضرور بندہ ومحکوم ہے اس لئے اگر محکوم نہ ہوتی تو اس سے مواخذہ کیوں
ہوتا لیکن یہ چیز اس بات کی دلیل نہیں بن سکتی کہ وہ مخلوق بشر یا انسان ہے
اس فرق کو ایک مثال سے واضح کیا جاسکتا ہے مثلاً کسی فرشتہ یا جن سے
کوئی ایسا فعل صادر ہوگیا کہ جس پر ان سے بازپرس کی گئی تو یہ چیز اس بات
کی واضح دلیل ہوگی کہ جن یا فرشتہ ضرور کسی کا بندہ اور محکوم ہے ورنہ اس کی
بازپرس ہی کیوں ہوتی اس کے برخلاف یہ بازپرس یا لغزش اس بات کی
دلیل نہیں بن سکتی کہ وہ جن یا فرشتہ، بشر اور انسان ہے۔ مطلب یہ ہے
کہ لغزش کا واقع ہونا یا اس پر بازپرس ہونا بشر ہونے کی دلیل نہیں
بنایا جاسکتا البتہ بندہ ومحکوم ہونے کی دلیل اس کو بنایا جاسکتا ہے اس
فرق کو سمجھ لینے کے بعد مودودی صاحب کے اس استدلال کی کمزوری کسی

بیان کی محتاج نہیں رہ جاتی ۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ انبیاء کرام سے یہ لغزش اس لئے ہوتی ہے

۲۔ تاکہ لوگ انبیاء علیہم السلام کو خدا نہ سمجھیں اور جان لیں کہ یہ بشر ہیں خدا نہیں ۔

کسی لغزش کے واقع ہونے سے یہ تو سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ خدا نہیں ہیں لیکن یہ کیونکر سمجھا جائے گا کہ وہ بشر ہیں کوئی دوسری مخلوق مثلاً جن یا فرشتہ نہیں ہیں البتہ یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ محکوم اور بندہ ہیں بالخصوص اس صورت میں جب کہ اس لغزش پر باز پرس بھی ہو جائے ۔ بنا بریں مودودی صاحب کا استدلال لغزش کے صادر ہو جانے سے بشر ہونے پر ہرگز درست نہیں ہے، اس وضاحت کو سامنے رکھنے کے بعد مودودی صاحب کی مذکورہ بالا عبارت کے درمیان اور حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کی اس عبارت کے درمیان فرق کر لینا کوئی دشوار کام نہیں ہے ۔

کبھی کبھی انبیاء علیہم السلام سے بعض معاملات میں زلت (لغزش) ہونے کے جو واقعات قرآن کریم میں مذکور ہیں وہ بھی عین حکمت و رحمت ہیں ۔ ان میں ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ لوگوں کو انبیاء کی خدائی کا وہم و شبہ نہ ہونے پائے ۔ زلات کا صدور اور حق تعالیٰ کی تنبیہات واضح کر دیتی ہیں کہ حضرات انبیاء بھی اللہ تعالیٰ کے بندے ہی ہیں (مجالس مبارکہ بحوالہ صدائے حق مئی)

خیال رہے کہ دونوں عبارتوں کے درمیان اس کے علاوہ ایک واضح فرق اور بھی ہے وہ یہ کہ مودودی صاحب کے نزدیک لغزش کے صدور کے لئے عصمت کا اٹھایا جانا بھی ضروری ہے اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت میں اس قسم کی کوئی بات مذکور نہیں ہے۔

سید طاہر حسین گیاوی

اللھم منک العصمۃ فی الاعمال والاقوال وبفضلک الصیانۃ عن الزلل والمیل الی الضلال نوفق لنا بما تحب وترضی ویھون لنا ان نکون المعصومین وعبادک المحبوبین والحمد للہ رب العالمین۔

تمت بالخیر

فہرست ماخذ ومراجع

۱	قرآن حکیم	۱۴	مرعاۃ	۲۷	فواتح الرحموت
۲	صحاح ستہ	۱۵	نووی شرح مسلم	۲۸	الملل والنحل
۳	مشکوٰۃ المصابیح	۱۶	شرح عقائد	۲۹	حاشیہ مشکوٰۃ
۴	تفسیر روح المعانی	۱۷	مسامرہ	۳۰	مالابد منہ
۵	تفسیر ابن کثیر	۱۸	شرح فقہ اکبر	۳۱	حاشیہ مالابد منہ
۶	تفسیر مدارک	۱۹	نبراس	۳۲	تفہیم القرآن
۷	تفسیر خازن	۲۰	حاشیہ نبراس	۳۳	تفہیمات دوم
۸	تفسیر عزیزی	۲۱	الانتقاد الرجیح	۳۴	رسائل ومسائل اول
۹	تفسیر مظہری	۲۲	الروضۃ البہیۃ	۳۵	فتحی الاسلام ثالث
۱۰	تفسیر صاوی	۲۳	ازالۃ الخفاء	۳۶	حاشیۂ الفوز الکبیر
۱۱	مرقات	۲۴	حجۃ اللہ البالغۃ	۳۷	ترجمان السنہ
۱۲	لمعات	۲۵	احیاء العلوم	۳۸	شرح مواقف
۱۳	اشعۃ اللمعات	۲۶	مسلم الثبوت	۳۹	تفسیر کبیر

خطوط نویسی

عربی، انگلش اور اُردو میں

تالیف : بدرالزماں قاسمی کیرانوی

عربی، انگلش اور اردو میں خط وکتابت سکھانے والی اپنی نوعیت کی منفرد اور بے مثال کتاب۔ جس میں سو سے زیادہ مختلف مواقع پر لکھے جانے والے خطوط اور ملازمت کے لیے دی جانے والی درخواستوں، نیز دفتری اور تعلیمی خط وکتابت کے نمونے پیش کیے گئے ہیں اس کے علاوہ خط وکتابت سے متعلق ضروری الفاظ اصطلاحات اور تعبیرات کا ایک بڑا ذخیرہ تینوں زبانوں میں جمع کردیا گیا ہے۔

اس سے قبل مؤلف کی ایک کتاب ”جدید عربی ایسے بولیے“ خراج تحسین حاصل کرچکی ہے۔

یہ کتاب بھی اہلِ ذوق حضرات کے لیے ایک انمول تحفہ ہے۔ قیمت =/70 روپے

کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

PRINT ART Delhi Ph. & Fax 23634222

30/=